دعوت رجوع الی القرآن ﷺ
کا منظر و پس منظر

ڈاکٹر اسرار احمد

95/1/0-

مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

دعوت
رجوع اِلی القرآن
کا منظر و پس منظر

تألیف

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳

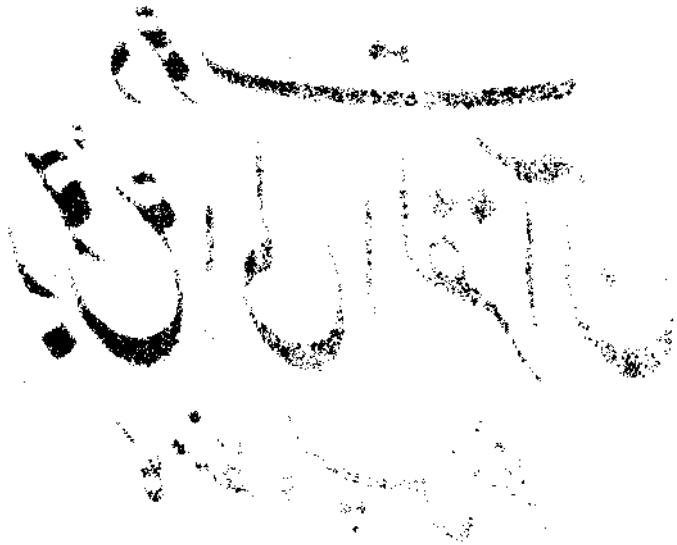

نام ———— دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر

مؤلف ———— ڈاکٹر اسرار احمد

بار اوّل ———— ۲۲۰۰

تاریخ اشاعت ———— مارچ ۱۹۹۰ء

ناشر ———— ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع ———— چوہدری رشید احمد

مطبع ———— مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ، لاہور

قیمت ———— مجلد: -/۶۵ روپے

〃 ———— غیر مجلد: -/۵۰ روپے

مقام اشاعت ———— ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: ۸۵۶۰۰۴

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل، شاہراہ لیاقت

نزد آرام باغ کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

انتساب

اُن باہمّت نوجوانوں کے نام

جو حدیثِ نبویؐ

خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ

کو اپنا نصب العین بنالیں!

اور تعلّم و تعلیم قرآن کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں وقف کردیں

بخاریؒ عن عثمانؓ ابن عفان مرفوعاً

تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن کا علم حاصل کریں
اور اسے دوسروں تک پہنچائیں

ترتیب

○

مقدّمہ

صفحہ ۳

○

حصّہ اوّل

دعوتِ رجُوع اِلی القرآن

موجودہ عالمی تہذیب کے تناظر میں

صفحہ ۳۱

○

حصّہ دوم

دعوتِ رجُوع اِلی القرآن کا تاریخی پس منظر

صفحہ ۷۷

○

حصّہ سوم

تحریکِ تعلّم و تعلیمِ قرآن

کے رُوح پرور منظر اور حیرت انگیز پیش رفت کا اجمالی خاکہ

صفحہ ۱۴۹

○

چند ضمیمے

صفحہ ۲۴۷

ع "گاہے گاہے باز خواں ایں قصّہ پارینہ را!"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز اور چودھویں صدی ہجری کے ربعِ اوّل کے اختتام کے لگ بھگ جو عظیم شخصیت بیک وقت برعظیم پاک و ہند کے سیاسی و قومی افق پر بھی ضوفشاں تھی، اور ملّتِ اسلامیہ ہندیہ کے دینی و روحانی افق پر بھی خورشیدِ جہانتاب کے مانند چمک رہی تھی، وہ اسیرِ مالٹا مولانا محمود حسنؒ کی تھی، جنہیں ملّت کے باشعور طبقات نے بجا طور پر شیخ الہند کا خطاب دیا ——— انہوں نے تقریباً نصف صدی تک روایتی تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف میں مشغول، اور جہادِ حریت و استخلاصِ وطن میں سرگرم رہنے کے بعد، اپنی حیاتِ دنیوی کے آخری ایام میں جبکہ ان کی عمر ستر سال سے متجاوز ہو چکی تھی، اور بقول مولانا ابوالکلام آزاد "ان کا قد بھی اُن کے دل کی مانند اللہ کے آگے جھک چکا تھا" دارالعلوم دیوبند میں منعقدہ ایک اہم اجتماع میں حلقۂ دیوبند کے جملہ اکابر علماء کی موجودگی میں اپنی پوری نے چار سالہ اسیری کے دوران کے غور و خوض کا حاصل، اور تامل و تفکر کا نچوڑ ان الفاظ میں بیان کیا:

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی میں قائم کیے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔"

یہ روایت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی ہے جو اُس اجلاس میں بنفسِ نفیس موجود تھے۔ اور انہوں نے اپنی تالیف "**وحدتِ امّت**" میں نہ صرف یہ کہ شیخ الہندؒ کے ان فرمودات کو نقل فرما کر امّت پر ایک احسانِ عظیم کیا، بلکہ ان پر یہ حکیمانہ اضافہ بھی فرمایا کہ:

"... قرآن کو چھوڑنا، اور آپس میں لڑنا، غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن پر کسی درجہ میں بھی عمل ہوتا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی۔" ('وحدتِ امّت' صفحات ۳۹، ۴۰)

عام محاورے کے مطابق تو اسے 'حسنِ اتفاق' ہی سے تعبیر کیا جائے گا لیکن حقیقتِ نفس الامری کے اعتبار سے یہ برِّعظیم کے مسلمانوں پر اللہ تعالےٰ کے عظیم فضل و کرم کا مظہر ہے کہ عین اُس وقت (۱۹۲۰ء مطابق ۱۳۳۸ھ) جب مذکورہ بالا آفتابِ ہدایت غروب ہو رہا تھا آیاتِ قرآنیہ: "وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ○ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ○" کے مصداق ——— اور حضرت شیخ الہندؒ کی اس گواہی کے عین مطابق کہ:

"میرے اُس درد کے غم خوار، جس میں میری ہڈیاں گھلی جا رہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں۔" (خطبۂ علی گڑھ)

جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے حلقے سے علامہ اقبال ایسے مفکرِ اسلام اور داعیِ قرآن کی شخصیت ماہتاب عالمتاب کے مانند نمودار ہو چکی تھی ——— اور الحمدللہ کہ اس نابغۂ ملت کی تشخیص و تجویز بھی بالکل یہی تھی کہ ؎

خوار از مہجوریِ قرآں شدی — شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندہ اُ — در بغل داری کتابِ زندہ اُ

اور ؎ گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست اُو — زندہ و پائندہ و گویاست اُو
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اور ؎ برخور از قرآں اگر خواہی ثبات در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

مزید برآں، حضرت شیخ الہندؒ کے فرمودات پر جو حکیمانہ اضافہ مفتی محمد شفیعؒ نے کیا تھا، اس حکیم الامت نے اس کی توثیق بھی نہایت آب و تاب اور غایتِ جلال و جمال کے ساتھ کر دی ——— یعنی ؎

از یک آئینی مسلماں زندہ است پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست اعتصامش کن کہ "حبل اللہ" اوست[1]
چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو!

گویا امتِ مسلمہ کے موجودہ زوال و اضمحلال اور ذلت و نکبت کے سبب کی تشخیص، اور اس کے اصل علاج کی نشاندہی کے ضمن میں چودھویں صدی ہجری کے ان دونوں اعاظم رجال کی آراء ع "متفق گردید رائے بوعلی با رائے من" کے مصداق متحد اور متفق ہو گئیں، اور ایسا ہونا بالکل فطری تھا، چونکہ کلامِ الٰہی اور حدیثِ رسولؐ کو دونوں کے غور و فکر کے اصل مبنیٰ و مدار اور منبع و سرچشمہ ہونے کی حیثیت حاصل تھی، اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واضح ارشاد صحیح مسلمؒ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں موجود ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتٰبِ اَقْوَامًا وَ یَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ" یعنی "اللہ تعالےٰ اسی کتاب (قرآن حکیم) کی بدولت بہت سی قوموں کو بامِ عروج پر پہنچائے گا، اور اسی (کو ترک کرنے) کے باعث دوسروں کو رسوا کر دے گا"۔ جو درحقیقت توضیح اور ترجمانی ہے اِن آیاتِ قرآنیہ کی کہ:

"وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰہُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ"[2]

اور "اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ○ وَمَا ھُوَ بِالْھَزْلِ"[3]

یعنی قرآن حکیم کسی شاعر کی لایعنی اور لاحاصل سخن سازی نہیں ہے بلکہ قوموں اور امتوں کے حق میں اللہ تعالےٰ کی عدالت کا مظہر بن کر نازل ہوا ہے اور اب اسی کی میزانِ عدل میں قوموں کی

---

[1] آیۂ قرآنی: "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا" آل عمران: ۱۰۳

[2] سورۂ بنی اسرائیل - آیت: ۱۰۵ [3] سورۃ الطارق - آیات: ۱۳ و ۱۴

قسمتیں تولی جائیں گی اور امتوں کی تقدیروں کے فیصلے ہوں گے۔

اِن سطور کا عاجز و ناچیز راقم اس عالمِ آب و گل میں حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بارہ سال بعد اور علامہ اقبال کی وفات سے چھ سال قبل (۱۹۳۲ء میں) وارد ہوا۔ اور جب اُس نے شعور کی آنکھ کھولی تو یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت شیخ الہندؒ کو تو اُن کے اپنے حلقے کے لوگوں نے بھی فراموش کر دیا تھا[1] البتہ علامہ اقبال کا طوطی بول رہا تھا اور اُن کی کم از کم اُردو شاعری کا ڈنکا برِّعظیم کے طول و عرض میں بج رہا تھا —— اور اس سے پیدا شدہ جذبۂ ملی تحریکِ پاکستان کی رُوحِ رواں بنا ہوا تھا۔ اِن حالات میں جب ۱۹۴۲ء میں راقم نے پانچویں جماعت کے طالبِ علم کی حیثیت سے "بانگِ درا" کی مشہور نظم "جوابِ شکوہ" پڑھی تو اس کا یہ شعر اس کے شعور میں پیوست ہو کر رہ گیا[2]

---

[1] میرے نزدیک اس کا سبب ع "اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شُدی!" کے مصداق حضرت شیخ الہندؒ کی وہ وسعتِ نظر، وسعتِ ظرف، اور وسعتِ قلب تھی جس کے تحت انہوں نے ایک جانب تو وہ بات فرمادی جس کا حوالہ اُوپر آ چکا ہے۔ یعنی "میرے اس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم، اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں!" —— اور ظاہر ہے کہ مدرسوں اور خانقاہوں کے باسیوں کو یہ بات کسی طرح بھی اچھی نہیں لگ سکتی تھی۔ —— اور دوسری جانب اپنے تلامذہ، متوسلین اور مسترشدین کے حلقے سے باہر کے ایک ستائیس سالہ نوجوان کے بارے میں نہ صرف یہ کہ یہ فرمادیا کہ" اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے" بلکہ اپنے قلبی احساسات کی ترجمانی اس شعر کے ذریعے بھی کر دی کہ ؎ "کامل اس طبقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی۔ کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے!" —— پھر ستم بالائے ستم یہ کہ ۱۹۲۰ء میں اپنے انتقال سے کچھ ہی دن پہلے یہ تجویز باصرار پیش فرمائی کہ جملہ علماء کرام اسی نوجوان (مولانا ابوالکلام آزاد کی عمر اس وقت کل بتیس ۳۲ برس تھی!) کو امام الہند مان کر اس کے ہاتھ پر بیعت کرلیں —— گویا حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے تلامذہ و متوسلین کا معاملہ اس شعر کا مصداقِ کامل ہے کہ ؎

والستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں ... اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا!

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

لہٰذا راقم نے اپنی نوجوانی میں اگرچہ عملاً تو اوّلاً مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ذریعے تحریکِ پاکستان میں حصّہ لیا، اور بعد ازاں اسلامی جمعیتِ طلبہ کے ذریعے تحریکِ اقامتِ دین سے وابستگی اختیار کی ——— لیکن اس عرصہ کے دوران، بحمداللہ، قرآنِ حکیم کے ساتھ اُس کے ذہن و قلب کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا ——— اور اِس 'سَیر اِلَی القرآن' کے ضمن میں راقم جہاں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور اُن کی تفہیم القرآن' اور مولانا ابوالکلام آزاد اور اُن کے ترجمان القرآن سے متعارف ہوا، اور اسی طرح مولانا امین احسن اصلاحی اور اُن کے استاذ اور امام حمید الدین فراہیؒ کے طریقِ 'تدبّرِ قرآن' سے روشناس ہوا، وہاں الحمدللہ کہ ۱۹۵۲ء کے لگ بھگ اس کا ذہنی و قلبی رشتہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی کے ذریعے سلفِ صالحین اور راسخون فی العلم کے "عُروۃ وثقیٰ" سے بھی قائم ہو گیا ——— اور اس کے بعد تین چار سال کے اندر اندر ہی راقم کے فہم و فکرِ قرآن کے ان 'ابعادِ ثلاثہ' پر ایک 'بُعدِ رابع' (FOURTH DIMENSION) کا اضافہ علّامہ اقبال کے فلسفیانہ، اور صحیح تر الفاظ میں متکلّمانہ اور متصوّفانہ افکار کا ہو گیا (جن کے ضمن میں راقم ڈاکٹر محمد رفیع الدین، اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا مرہونِ منّت ہے)۔

راقم کے 'درسِ قرآن' کا چرچا زمانۂ تعلیم ہی میں اسلامی جمعیتِ طلبہ سے وابستگی کے دوران ہو گیا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں ایم بی بی ایس کی تکمیل کے بعد راقم منٹگمری (حال ساہیوال) منتقل

(گزشتہ سے پیوستہ)

یہی وجہ ہے کہ جب راقم نے پہلی بار مولانا سید حامد میاںؒ مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور اور خلیفۂ مجاز سید حسین احمد مدنیؒ کے سامنے اپنی اس رائے کا اظہار کیا کہ چودھویں صدی ہجری کے اصل مجدد حضرت شیخ الہندؒ تھے تو وہ ایک دم چونک سے گئے۔ اور انہوں نے میری رائے کی تصویب فرماتے ہوئے اعتراف کیا کہ حلقۂ دیوبند میں کسی کا ذہن ادھر نہیں گیا۔ اور نگاہیں یا مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرف اٹھتی ہیں یا مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی جانب!

ہوا تو اگرچہ اس کے بعد سے ۱۹۶۵ء تک کے گیارہ سالوں کے دَوران حالات کے کئی اُتار چڑھاؤ آئے اور وصل و فصل کی متعدد داستانیں رقم ہوئیں، چنانچہ جماعتِ اسلامی سے وابستگی بھی ہوئی اور پھر سوا دو سال کے بعد علیحدگی بھی۔ مزید بر آں دو مرتبہ کراچی نقل مکانی ہوئی، ایک بار ۱۹۵۸ء میں اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے نئی رفاقت کی تلاش میں، اور دوسری بار ۱۹۶۲ء میں ایک مشترک خاندانی کاروبار کے سلسلے میں ـــــ لیکن الحمد للہ کہ اس پورے عرصے کے دَوران ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار   لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا!

کے مصداق درس و تدریسِ قرآن اور تعلّم و تعلیمِ قرآن کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ چنانچہ ساہیوال میں تو نہ صرف یہ کہ مقامی طور پر میرے درسِ قرآن کا ڈنکا بج گیا تھا بلکہ آس پاس کے شہروں اور قصبوں یعنی اوکاڑہ، پاکپتن، چیچہ وطنی اور عارف والہ میں بھی ماہانہ درسِ قرآن کا سلسلہ چل نکلا تھا ـــــ اسی طرح کراچی میں بھی کبھی ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی مرحوم کے زیرِ اہتمام ـــــ اور کبھی خود اپنے ہی انتظام و انصرام میں درسِ قرآن کا سلسلہ جاری رہا ـــــ مزید بر آں، کراچی کی پہلی نقل مکانی کے دَوران راقم نے مولانا افتخار احمد بلخی مرحوم سے تفسیر بیضاوی کا ابتدائی حصہ سبقاً سبقاً پڑھا اور دوسری نقلِ مکانی کے دَوران اُن ہی کے اصرار پر کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر ۱۹۶۵ء میں ایم اے اسلامیات کا امتحان پاس کر لیا۔ (جس میں اتفاقاً یونیورسٹی میں اوّل پوزیشن بھی آ گئی!)

۱۹۶۵ء ہی کے وسط میں راقم الحروف غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد کے پختہ ارادے اور تعلّم و تعلیمِ قرآن کی منظّم منصوبہ بندی کے عزمِ مصمّم کے ساتھ دوبارہ واردِ لاہور ہوا۔ چنانچہ وہ دن اور آج کا دن یہی دو کام میری زندگی کا مرکز و محور رہے ہیں۔ اور اِن پچیس سالوں کے دَوران الحمد للہ، ثم الحمد للہ، کہ میرے اوقات اور میری صلاحیتوں اور توانائیوں کا اکثر و بیشتر حصہ اصلاً غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد، اور عملاً تعلّم و تعلیمِ قرآن کی مساعی میں صرف ہوا ہے۔

اِس رُبع صدی کے پہلے پانچ سالوں کے دَوران تو ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی،   کیا طُرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی!

کے مصداق میڈیکل پریکٹس کا تسمہ بھی لگا رہا ——— بعد کے بیس سالوں کے دَوران تو ع "جو لکھا پڑھا تھا نیازؔ نے اُسے صاف دِل سے بھلا دیا!" ——— اور ع "وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا!" کے مصداق یہ تہمت بھی باقی نہ رہی۔ اور نیتوں کا معاملہ تو اللہ ہی کے حوالے ہے، کم از کم ظاہری اور خارجی اعتبار سے اس پورے عرصے کے دَوران راقم 'ہمہ وقت' اور 'ہمہ وجوہ' ان ہی مقاصدِ عظیمہ کے لیے 'وقف' رہا۔ اور 'ناگزیر استراحت' اور ضروری علائق وحوائجِ دنیوی کے سوا راقم کے وقت کا کوئی لمحہ، اور اس کی صلاحیت اور توانائی کا کوئی شمّہ حصولِ دنیا یا تلاشِ معاش کی مساعی میں صرف نہیں ہوا! فللہ الحمد والمنّۃ!!

اور اب جبکہ راقم کی عمر شمسی حساب سے اٹھاون، اور قمری تقویم سے ساٹھ برس ہو چاہتی ہے، ——— اور راقم کی قلبی کیفیت فی الواقع وہی ہے جو انشاء اللہ خاں انشاؔ کے اس شعر میں بیان ہوئی کہ ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں   بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں!

اور میں واقعتہً اپنے آپ کو الفاظِ قرآنی: "وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝" (الواقعہ: ۸۵) کے مصداق عالمِ آخرت سے قریب تر اور عالمِ دُنیا سے ذہناً اور قلباً بعید اور منقطع محسوس کرتا ہوں ——— جب کبھی تنہائی میں اپنی گزشتہ زندگی خصوصاً اس کے چالیس سالہ شعوری دَور پر نگاہ ڈالتا ہوں تو ——— اوّلاً تو نہ صرف یہ کہ اپنے باطن میں نہایت گہرے سکون اور اطمینان کا احساس ہوتا ہے کہ ع "جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے!" بلکہ قلب و روح کی سرزمین پر ایک جانفزا فرحت اور مسرت آمیز انبساط کی تسکین بخش پھوار سی پڑتی محسوس ہوتی ہے کہ ع "شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم!" ——— اور اس کے معاً بعد قلب کی گہرائیوں سے شکرِ الٰہی اور حمدِ خداوندی کا چشمہ اُبلنے لگتا ہے کہ یہ سب اُسی تعالیٰ کا فضل و کرم اور اُسی تعالیٰ کی توفیق وتیسیر ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم!! ——— بلکہ یہ تو ایک مشہور مقولہ ہے جو غیر ارادی طور پر قلم سے ٹپک پڑا ورنہ واقعہ یہ ہے کہ یہ میرے حقیقی اور واقعی احساس کی تعبیر سے قاصر ہے، اس لیے کہ بحمد اللہ، میرے سامنے تو ہر آن یہ حقیقت رہتی ہے کہ: "هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ

اِذْ اَنْشَاَ كُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی ‘‘ (النّجم : ۳۲)

قارئین میرے اس اظہارِ اطمینان وانبساط کو کسی تعلّی، یا تکبّر، یا اعجابِ نفس پر محمول نہ کریں، اس لیے کہ راقم کے نزدیک اس حقیقت کا شعور وادراک تو ایمان کا صرف ابتدائی درجہ ہے کہ انسان کا کوئی ارادہ اللہ تعالیٰ کی توفیق وتیسیر کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ اللہ کے فضل و کرم سے راقم الحروف کو تو اِس امر کا بھی حق الیقین حاصل ہے کہ خود انسانی ارادہ بھی سراسر مشیتِ الٰہی کے تابع ہے اور کسی نیک کام کی توفیق وتیسیر ہی نہیں، اُس کے ارادے کی ابتدائی تحریک بھی اُسیؔ کی جانب سے ہوتی ہے ——— گویا معاملہ صرف ’’لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ‘‘ ——— اور ’’لَا فَاعِلَ فِی الْحَقِیْقَةِ وَلَا مُؤَثِّرَ اِلَّا اللّٰهُ‘‘ ہی کا نہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ’’وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ‘‘ (الدھر: ۳۰) کا ہے!!

——— اور میرے نزدیک ’’ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی ○ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِیْ‘‘ (طٰهٰ : ۴۰-۴۱) کی کیفیت صرف حضرتِ موسیٰ علیہ السلام ہی کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ مبدءِ فیاض کی جانب سے جس انسان کو بھی کسی خیر کی توفیق ارزانی ہوتی ہے اس کے معاملے میں کسی نہ کسی درجے میں اِسی کیفیت کا انعکاس موجود ہوتا ہے!

اور ’’من آنم کہ من دانم‘‘ کے مصداق، ظاہر ہے کہ، یہ میں ہی جانتا ہوں کہ میرا ربّ مجھے کہاں کہاں سے بچا کر لایا ہے، کن کن مراحل پر اُس نے میری دستگیری فرمائی ہے، اور کن کن مواقع پر اُس نے مجھے گویا دھکیل کر اپنی راہ پر لگایا، اور کسی دوسری جانب متوجہ ہونے سے روکا ہے!

لہٰذا میرا اظہارِ مسرت ہرگز کسی جذبۂ تفاخر ومفاخرت کی بنا پر نہیں، بلکہ محض ’تحدیثًا لِلنِّعمة‘ ہے ——— اور شکرِ خداوندی، اور ’’وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ‘‘ (الضحیٰ: ۱۱) کی تعمیل کے علاوہ اگر کوئی اور جذبہ اس میں شامل ہے تو وہ بھی ’’فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ‘‘ (التوبہ : ۱۱۱) اور ’’فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا‘‘ (یونس: ۵۸) کے سوا کچھ نہیں۔

تو کیسے ممکن ہے کہ میں اظہارِ مسرت نہ کروں، بلکہ خوشیاں نہ مناؤں اس پر کہ اللہ تعالیٰ نے

نے اپنے ایک عاجز اور ناچیز بندے کو جس نے سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائی، اور جو کالج کی سطح پر نہ کبھی ادب یا فلسفہ کا طالب علم رہا، نہ عمرانیات یا اسلامیات کا، بلکہ سائنس اور طب کی تحصیل میں مصروف رہا ــــ "اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ" کے مصداق اپنی کتاب حکیم کے علم و حکمت اور خاص طور پر اُس کی دعوت کی نشر و اشاعت کے لیے اس درجہ **خالص** کر لیا کہ اسے سہ ماہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم۔ اِلّا حدیثِ دوست کہ تکرار می کنیم!" کے مصداق تعلیم و تعلّم قرآن کے سوا دنیا کی کسی دوسری چیز سے کوئی دلچسپی نہ رہی، اور پھر اس کے درسِ قرآن کو اتنا قبولِ عام بخشا کہ وہ

"عوامی درسِ قرآن"

کے اُس خواب کی عملی تعبیر بن گیا جو لگ بھگ نصف صدی قبل چودھویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم نے دنیا سے رحلت کے قریب دیکھا تھا! ع "یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے!"

رہا شکرِ خداوندی، تو واقعہ یہ ہے کہ اگر میرے ہر بُنِ مو ہی نہیں جسم کے ہر خُلیے کو زبان عطا ہو جائے جو ہر لحظہ اور ہر آن حمد و تسبیح میں مشغول رہے، تب بھی اللہ تعالیٰ کے اُس احسانِ عظیم اور فضلِ کبیر (جو یقیناً "اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا" بنی اسرائیل: ۸۷ ہی کا ایک ادنیٰ عکس ہے) کے شکر کا حق ادا نہیں ہو سکتا جو اِس عبدِ ضعیف پر اس صورت میں ہوا کہ اس نے اوّلاً اسے اپنی اُس کتابِ عزیز کے علم و فہم اور ہدایت و حکمت کے ساتھ ذہنی اور قلبی مناسبت عطا فرمائی جسے خود اُس نے "اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝" کی رُو سے اپنی شانِ رحمانیت کا مظہرِ اعظم قرار دیا ہے، اور پھر اُسے اس دَور میں کم از کم اُردو سمجھنے والے لوگوں کی حد تک "خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝" کی عملی تفسیر بنا دیا۔ اور اس **بیان القرآن** کے لیے اُس کے ذہن اور زبان کی گرہوں کو اس طرح کھول دیا کہ بلا مبالغہ سینکڑوں نہیں ہزاروں انسان اس کے درسِ قرآن کو مسلسل دو دو ڈھائی ڈھائی گھنٹے تک بالکل ساکن و ساکت اور ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں اور اُن کی دلچسپی بجائے کم ہونے کے بڑھتی چلی جاتی ہے!

ناواقف حضرات ان الفاظ کو یقیناً مبالغے پر محمول کریں گے، لیکن اس تحریر میں اس

حقیقتِ واقعی کے مفصل شواہد پیش کرنا ممکن ہے نہ مطلوب! البتہ وہ ہزاروں اشخاص جنہوں نے کبھی لاہور میں مسجد خضرا، یا مسجد شہداء کے اتوار کی صبح کے ہفتہ وار درسِ قرآن کا منظر دیکھا ہے، یا جنہوں نے کراچی کی بے شمار مساجد میں درسِ قرآن کے اجتماعات، اور اُن پر مستزاد تاج محل ہوٹل کے وسیع و عریض آڈیٹوریم میں "شامِ الہدیٰ" کی نشستوں میں سے کسی میں شرکت کی ہے، یا جنہیں ستمبر ۱۹۷۹ء میں ٹورنٹو (کینیڈا) کے چودہ روزہ درسِ قرآن کی کیفیات کے مشاہدے کا موقع ملا ہے، یا جنہوں نے دسمبر ۱۹۸۵ء میں ابوظبی کے ہفت روزہ مجالسِ درس کے شرکاء کے جوش و خروش اور ہجوم و اژدھام کی جھلک دیکھی ہے ——— اور سب سے بڑھ کر جنہوں نے اپریل ۱۹۸۴ء میں مکہ مسجد، حیدر آباد (دکن) کا منظر دیکھا ہے جہاں مسلسل تین دن محتاط ترین اندازے کے مطابق پندرہ ہزار مردوں اور پانچ ہزار خواتین نے ڈھائی ڈھائی گھنٹے کے خطباتِ قرآنی میں انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ شرکت کی تھی، وہ گواہی دیں گے کہ مبالغے کا کیا سوال، مندرجہ بالا الفاظ تو ان مجالس کی واقعی کیفیات کی بدرجۂ ادنیٰ ترجمانی سے بھی یکسر قاصر ہیں!

اسی طرح پاکستان ٹیلیویژن پر لگ بھگ چار سال تک راقم کے 'بیان القرآن' کا جو ڈنکہ بجتا رہا اس کی حسین اور خوشگوار یادیں، اس کی بندش پر ساڑھے سات سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود، لاکھوں نہیں کروڑوں لوگوں کے قلوب و اذہان میں اب تک تازہ ہیں۔ چنانچہ مسلسل تین سال تک پورے ماہ رمضان مبارک کے دوران افطار سے متصلاً قبل "الکتٰب" اور "الٓمّٓ" کروڑوں بندگانِ خدا کے لیے "نورٌ علیٰ نورٍ" کے مصداق روزہ کی برکات پر مستزاد روح کی بالیدگی کا سامان فراہم کرتے رہے، اسی طرح "حکمت و ہدایت" کے ذریعے ذہن و فکر کو قرآنی غذا ملی، تو "رسولِ کامل" کے ذریعے قرآنی فلسفۂ رسالت، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کے اختتام اور رسالت کی تکمیل کے عملی تقاضوں کے شعور کی خوشبو سے پاکستان کی فضائیں معطر ہوئیں ——— اور سب سے بڑھ کر جب مسلسل پندرہ ماہ تک ہر ہفتے "الہدیٰ" کے ہدایت آفریں اور ایمان پرور نغموں سے پاکستان کا طول و عرض وجد میں آگیا (اس لیے کہ یہ پروگرام پورے پاکستان میں نیشنل نیٹ ورک آپ پر پاکستان کے تمام ٹیلیویژن اسٹیشنوں سے بیک وقت ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا) ——— تو ایک جانب اسے جو قبولِ عام حاصل ہوا، اور اس سے جو شہرت راقم کو حاصل ہوئی اس کی مقدار اتنی زیادہ

تھی کہ راقم کو اپنے بارے میں فتنہ و استدراج کے اندیشے لاحق ہو گئے ـــــ اور دوسری جانب سے "میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں۔ غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں!" کے مصداق الحاد اور اباحیت کے ایوانوں میں زلزلہ آگیا اور مغرب کی مادر پدر آزاد تہذیب کے دلدادہ مردوں اور عورتوں کی جانب سے الامان والحفیظ کا شور اسی طرح بلند ہوا جس طرح کبھی حضرتِ موسیٰؑ کی للکار سے فرعون اور اس کے حواریوں کے ایوانوں میں "وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ" کی دہائی کی صورت میں ہوا تھا ـــــ یعنی "یہ دونوں (موسیٰؑ اور ہارونؑ) چاہتے ہیں کہ تمہاری مثالی تہذیب کو تباہ اور تمہارے قابلِ فخر تمدن کو ملیامیٹ کر دیں، پس اپنی پوری قوت کو مجتمع کرو اور ان کے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑے ہو! گویا بقول اقبالؔ ع "نظام کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے!"[1]

تو کیسے ممکن ہے کہ میری روح وجد میں نہ آتے اور میں اپنے باطن میں اُس کیفیت کے حامل "رقصِ جاں" کا مشاہدہ نہ کروں جس کا نقشہ عُرفیؔ نے اپنے اس شعر میں کھینچا ہے کہ ؎

چہ خوش رقصید عُرفی بر درِ کاشانۂ وحدت ۔۔۔ برہمن گفت ایں کافر چہ استادانہ می رقصد!

جبکہ میرے علم میں مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی یہ "خبر" بھی ہے کہ:

"مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ اللهِ يَتْلُونَ كِتَابَ اللهِ وَيَتَدَارَسُونَهُ بَيْنَهُمْ إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِينَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَذَكَرَهُمُ اللهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ"[2]

بلکہ اس خبر سے بڑھ کر اور "ضمانت" بھی ہے جو اُس طویل حدیث کے آخر میں وارد ہوئی

---

[1] اس پر بھی اللہ کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے اس آزمائش میں بھی مجھے کامیابی عطا فرمائی اور میں نے ٹی وی سے مستقل انقطاع قبول کر لیا لیکن اپنے موقف میں کوئی لچک پیدا نہ کی!

[2] مسلمؒ عن ابی ہریرہؓ: "جب بھی کبھی کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر اللہ کی کتاب پڑھتے اور آپس میں سمجھتے سمجھاتے ہیں تو ان پر سکینت کا نزول ہوتا ہے، رحمتِ خداوندی ان پر سایہ کر لیتی ہے، فرشتے اُن کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا تذکرہ اپنے (ملائکہ وارواحِ) مقربین کے سامنے کرتا ہے"

ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشاد فرمانے پر کہ: "اِنَّهَا سَتَكُونُ فِتْنَةٌ" (عنقریب ایک بہت بڑا فتنہ رونما ہوگا) جب حضرت علیؓ نے سوال کیا: "مَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ" (اے اللہ کے رسولؐ اس سے بچ نکلنے کا راستہ کون سا ہوگا؟) تو اس کا کافی وشافی جواب تو آپؐ نے دو الفاظ میں ادا فرمادیا یعنی "كِتٰبُ اللّٰهِ" لیکن اس کے بعد اس کی مزید تشریح کے طور پر آپؐ نے کتاب اللہ کی مدح اور اس کی عظمت کے بیان میں فصاحت وبلاغت کے جو موتی پرو دئیے ان میں خود قرآن کی معجزانہ فصاحت وبلاغت کا کامل عکس موجود ہے ــــــ اور جہاں اس بیانِ عظمتِ قرآن کے تین تین حسین جملوں پر مشتمل یہ حصے بھی لائقِ حفظ ہیں کہ:

- فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ
- وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِينُ وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيمُ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيمُ
- لَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ
- مَنْ قَالَ بِهِ صَدَقَ وَمَنْ عَمِلَ بِهِ أُجِرَ وَمَنْ حَكَمَ بِهِ عَدَلَ

وہاں آخری نوید جانفزا تو اس قابل ہے کہ ہر خادمِ قرآن اسے حرزِ جاں بنا لے ــــــ یعنی:

"وَمَنْ دَعَا إِلَيْهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ"[1]

---

[1] جامع ترمذیؒ وسنن دارمیؒ: "● اس میں تم سے پہلے گزر جانے والوں کی اطلاعات بھی ہیں، اور تمہارے بعد پیش آنے والے حالات کی خبر بھی ہے اور تمہارے مابین ہونے والے جملہ اختلافات اور نزاعات کا حل بھی ہے۔ ● یہی اللہ کی مضبوط رسی ہے، اور یہی حکمت بھرا ذکر ہے، اور یہی صراطِ مستقیم ہے ● اس کی رعنائیاں کبھی ختم نہ ہوں گی اور اہلِ علم اس سے کبھی سیر نہ ہوں گے اور بار بار پڑھنے کے باوجود اس پر باسی پن طاری نہ ہوگا ــــــ ● جس نے اس کی بنیاد پر کوئی بات کی اُس نے سچ کہا، جس نے اس پر عمل کیا اس کا اجر محفوظ ہے اور جس نے اس کی بنیاد پر فیصلہ کیا اس نے انصاف کیا ــــــ (اور سب سے بڑھ کر یہ کہ) جس نے اس کی جانب دعوت دی (خواہ کسی اور کو اس سے کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو) خود اُس کو صراطِ مستقیم کی ہدایت نصیب ہوگئی!!!

ان بشارتوں اور ضمانتوں پر بھی اگر کوئی 'داعی اِلَی القرآن' فرطِ مسرت سے جھوم نہ اُٹھے تو یا تو اس کا وعظ و درس خالص ریاکاری پر مبنی ہے' اور اس کا ضمیر اسے متنبہ کرتا رہتا ہے کہ تم یہ ساری دوڑ دھوپ خالصتہً لوجہ اللہ نہیں کر رہے' یا اس کی ساری تگ و تاز صرف عقل اور حواس کی دلیلوں تک محدود ہے' اور ع "گزر اُن کا ہو اکب عالم اللہ اکبر میں!" کے مصداق قلب کی اُس وادی میں اس نے قدم ہی نہیں رکھا جہاں فطرتِ سلیمہ کی گہرائیوں سے شکر و حمد کے چشمے اُبلتے ہیں ——— اور انشراح و انبساط کے پھول کھلتے ہیں ——— یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ "یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ یُنْكِرُوْنَهَا" (النحل: ۸۳) کے جُرم کے مرتکب ہوتے ہیں ——— اعاذنا اللہ من ذٰلك!

معذرت خواہ ہوں کہ بات ع "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" کے مطابق طویل ہو گئی حاصلِ کلام یہ کہ عمر کے اعتبار سے "شامِ زندگی" کے اُس دور میں قدم رکھتے ہوئے جس کے بعد "صبحِ دوامِ زندگی" ہی کے طلوع کا انتظار ہے' راقم بحمد اللہ اپنے ماضی کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہے کہ ع "جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے!" اور ع "شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم!" ——— اور ایک عربی مصرعے "وَاَرْجُوْهُ رَجَاءً لَا یَخِیْبُ" کے مصداق راقم کو اُمیدِ واثق ہے کہ جس نے توفیقِ عطا کی' اور تیسیر فرمائی' وہ شرفِ قبول بھی ضرور عطا فرمائے گا۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ[1]

راقم پر اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و کرم یہ ہے کہ جس کام میں اُس نے اپنی متاعِ زیست صرف

---

[1] النمل: ۱۹ "اے میرے رب! مجھے ہمت عطا فرما کہ میں تیرے اس فضل کا شکر ادا کر سکوں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا' اور مجھے توفیق عطا فرما کہ میں وہ کام کروں جو تجھے پسند ہوں' اور اپنی رحمت کے طفیل مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل فرمالے!"

کی، اور تحریک تعلّم و تعلیمِ قرآن کے جس پودے کو اُس نے اپنے خون اور پسینے سے سینچا اور پروان چڑھایا، اُس کے مستقبل کے بارے میں وہ بہت پُر امید ہے!

راقم کی یہ اُمید اصلاً تو ظاہر ہے کہ "وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ" کے مطابق اللہ ہی کے سہارے قائم ہے، تاہم اُسیؐ کے فضل و کرم سے عالمِ اسباب میں بھی اس امید کی پیدائش اور افزائش کے دو اسباب وجود میں آچکے ہیں:

ایک یہ کہ میرے دروس و خطبات کے سمعی اور بصری کیسٹ پوری دنیا میں بہت بڑی تعداد میں پھیل چکے ہیں۔ اِن کی صحیح تعداد کا علم تو ظاہر ہے کہ سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا اس لیے کہ "اَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا" (الجنّ: ۲۸) اُسیؐ کی شان ہے۔ کتابوں کا معاملہ مختلف ہے، اُن کے ایڈیشن بھی گنے ہوئے ہوتے ہیں اور ہر ایڈیشن کی تعداد بھی معلوم ہوتی ہے، بخلاف کیسٹوں کے، کہ ان کے تو نقل در نقل کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے جو از خود دراز ہوتا چلا جاتا ہے اور کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے —— تاہم محتاط اندازہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں میرے دروسِ قرآن اور خطباتِ قرآنی کے محض سمعی (آڈیو) کیسٹ تو پندرہ بیس لاکھ سے ہرگز کم نہ ہوں گے، اور سمعی و بصری (ویڈیو) کیسٹوں کی تعداد بھی بیس پچیس ہزار ضرور ہوگی، واللہ اعلم!

آڈیو کیسٹوں کا اہم ترین سلسلہ تو مطالعۂ قرآن حکیم کے میرے اپنے مرتّب کردہ منتخب نصاب کے دروس کا ہے جو میری اس قرآنی تحریک کی جڑ اور اساس ہے۔ اور چونکہ میں نے اس نصاب کا درس بارہا دیا ہے، کبھی مختصر اور کبھی نہایت مفصل و مطوّل، لہٰذا اس کے کئی سیٹ موجود ہیں!

البتہ اس منتخب نصاب کے دروس کی ایک ریکارڈنگ وہ بھی ہے جو "کیز ایڈورٹائزنگ کمپنی کراچی" کے مالک لطف اللہ خاں صاحب کے ذوق و شوق اور اصرار و اہتمام کے نتیجے میں اُن کے ذاتی "ساؤنڈ پروف اسٹوڈیو" میں ٹھیک آدھے آدھے گھنٹے کے ٹکڑوں (CHUNKS) کی صورت میں ہوئی۔ اور چونکہ میرا یہ بیان ایک بند کمرے میں ہوا جس میں میرے اور خان صاحب موصوف کے سوا کوئی "سامعین" موجود نہیں ہوتے تھے لہٰذا اِن میں خطابت کا جوش و خروش تو بالکل نہیں ہے، تاہم ریکارڈنگ بھی صاف ہے اور اندازِ بیان بھی سادہ اور

عام فہم! لہٰذا ان کی مستقل افادیت کا دائرہ وسیع تر بھی ہے اور پائدار تر بھی ـــــ ایک ایک گھنٹے کے چوالیس ۴۴ کیسٹوں پر مشتمل یہ سیٹ بحمداللہ ہزاروں کی تعداد میں تیار ہوا اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کہاں کہاں تک پہنچا!

اسی طرح "حقیقت و اقسامِ شرک" کے موضوع پر میرے خطبات کے کیسٹوں کا ایک سیٹ بھی بحمداللہ بہت عام ہوا ـــــ اور جہاں بعض چوٹی کے علماء کے بارے میں اطلاع ملی کہ انہوں نے اس کی بہت قدر اور تحسین فرمائی وہاں بعض حضرات ایسے بھی علم میں آئے جنہوں نے ان کیسٹوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں پھیلانے ہی کو ایک مستقل مشن کے طور پر اختیار کر رکھا ہے۔ (یہ سیٹ ایک ایک گھنٹے کے چھ کیسٹوں پر مشتمل ہے!)

ستمبر ۱۹۷۹ء میں ٹورنٹو (کینیڈا) کے جس چودہ روزہ درسِ قرآن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اس کے مکمل کیسٹ ایک کرم فرما سمیع اللہ خان صاحب نے نہایت اہتمام اور محنت و مشقت سے تیار فرمائے جن کی ریکارڈنگ کا معیار نہایت اعلیٰ تھا۔ یہ سیٹ بھی بحمداللہ مشرق و مغرب میں بہت دُور دُور تک پہنچا۔

اسی طرح فروری ۱۹۷۸ء میں ماڈل ٹاؤن لاہور کی مختلف بلاکوں کی مساجد میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر نو تقاریر کا راؤنڈ مکمل کیا گیا تھا۔ اس کے ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے کے گیارہ کیسٹوں کا سیٹ بھی بڑی تعداد میں شائع ہوا۔

میرا ابتدا سے پورے قرآن مجید کا سلسلہ وار درس بیس سال میں تکمیل کو پہنچا ہے، اس کی پوری ریکارڈنگ تو موجود نہیں ہے، اس لیے کہ آغاز میں خاص اہتمام بھی نہیں تھا، علاوہ ازیں ابھی کیسٹوں کا رواج بھی نہیں ہوا تھا بلکہ ریکارڈنگ بھاری بھرکم ریکارڈروں کے ذریعے ٹیپ کی 'چرخیوں' (SPOOLS) میں ہوتی تھی، تاہم بحمداللہ بہت سے حصوں کے بالخصوص بائیسویں پارے کے بعد کی اکثر و بیشتر سورتوں کے دروس کیسٹوں میں محفوظ ہیں!

اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ رمضان مبارک میں نمازِ تراویح کے ساتھ 'دورۂ ترجمۂ قرآن' کا جو سلسلہ پانچ چھ سال سے شروع ہوا ہے اس نے تو اللہ کے فضل و کرم سے فی نفسہٖ اور بجائے خود ایک مکمل تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے، اور اس کے ۱۹۸۵ء کے ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹوں کے

ترکیہ[۴۳]، اور ۱۹۸۷ء کے ایک ایک گھنٹے کے تراسّی[۸۳] کیسٹوں کے سیٹ سینکڑوں کی تعداد میں تو ہمارے اپنے اہتمام میں تیار ہو کر پھیل چکے ہیں۔ آگے یہ کہاں کہاں تک پہنچے اس کا حساب صرف اللہ کے پاس ہے۔

ان کے علاوہ بے شمار دینی موضوعات پر میری لاتعداد تقاریر آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں میں محفوظ ہیں، اور گاہے گاہے ایسے لوگوں سے ملاقات ہوتی رہتی ہے جو راقم سے اپنا ابتدائی تعارف ہی اس حوالے سے کراتے ہیں کہ "میرے پاس آپ کے تین صد، یا چار صد، یا پانچ صد کیسٹ موجود ہیں"!

بصری (ویڈیو) کیسٹوں کا سلسلہ دیر میں شروع ہوا تھا ——— اور میرے علم کی حد تک اس کا پہلی بار خصوصی اہتمام رفقائے ابوظبی نے دسمبر ۱۹۸۵ء میں کیا تھا۔ وہاں کے نو[۹] روزہ پروگرام کے جو ویڈیو تیار ہوئے ان کا فنی معیار بہت بلند تھا، ——— لہٰذا وہ بھی ٹورنٹو کے آڈیوز کی طرح بہت بڑی تعداد میں لوگوں تک پہنچے ——— چنانچہ اُن کے حوالے سے کبھی کوئی خط جنوبی ہند اور سیلون سے آجاتا ہے تو کبھی جنوبی افریقہ سے، اور کبھی آسٹریلیا سے آجاتا ہے تو کبھی یورپ کے کسی ملک سے! وقِس علیٰ ذٰلک!

اس کے بعد سے ویڈیو ریکارڈنگ کا سلسلہ بھی بڑے پیمانے پر چل نکلا۔ چنانچہ اس وقت صرف لاہور میں تیار ہونے والے تین تین گھنٹے کے ویڈیو کیسٹوں کے ایک صد چار اساسی نسخے (MASTER COPIES) دفترِ انجمن میں موجود ہیں۔ جن میں اہم ترین سیٹ ۱۹۸۷ء کے مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن، سورۂ قٓ سے سورۂ مزمل تک کے مسلسل درسِ قرآن، اور مارچ ۸۹ء کے محاضراتِ قرآنی کے پروگرام میں ہونے والے 'اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی' کے خطبات پر مشتمل ہیں۔

ان پر ایک مستقل قِسم (CATEGORY) کا اضافہ کر لیا جائے کہ اندرونِ ملک گزشتہ بیس سالوں کے دَوران جن بے شمار شہروں اور قصبوں کے دَورے میں نے کیے اُن کے دروس اور خطابات اور گزشتہ دس سالوں کے دَوران امریکہ، یورپ، بھارت، سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کے جو بیسیوں دَورے میں نے کیے اور ان کے دوران سینکڑوں شہروں میں درس دیئے یا تقاریر کیں اُن کے جو آڈیو اور ویڈیو کیسٹ مقامی حضرات نے تیار کیے اور اُن کی جو نقول وہاں گردش میں ہیں اُن کا حساب بھی صرف عالم الغیب والشہادہ کے علم میں ہے!

اقبالؔ کے اس شعر کے مصداق کہ "فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا۔ یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک"، راقم کو یقین ہے کہ قرآن کی وہ انقلابی دعوت جو ان لاکھوں کیسٹوں کے ذریعے پورے کرۂ ارضی پر گونج رہی ہے[1] ہرگز بے نتیجہ اور غیر مؤثر نہیں ہو سکتی، اور جس طرح ایران کے انقلاب کو دنیا نے "کیسٹ ریوولیوشن" قرار دیا تھا اسی طرح، انشاء اللہ العزیز مستقبل کے اسلامی انقلاب اور اسلام کے عالمی غلبے کے ضمن میں راقم کے دروس و خطباتِ قرآنی کے یہ کیسٹ مؤثر اور فیصلہ کن رول ادا کریں گے ——— اور اوّلاً تو، جیسے کہ میں نے اپنی تالیف "استحکامِ پاکستان" میں دلائل و شواہد کی بنیاد پر عرض کیا ہے، اِس عالمی اسلامی انقلاب کا نقطۂ آغاز سلطنتِ خداداد پاکستان ہی بنے گا۔ لیکن اگر ہماری شامتِ اعمال سے پاکستان یہ سعادت حاصل نہ کر سکا تب بھی "فَاِنْ یَّکْفُرْ بِھَا ھٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَکَّلْنَا بِھَا قَوْمًا لَّیْسُوْا بِھَا بِکٰفِرِیْنَ" (الانعام: ۸۹) کے مطابق اللہ تعالیٰ ان کیسٹوں کے ذریعے پھیلنے والی دعوتِ قرآنی کو کسی اور زمین میں بار آور فرمائے گا ——— اس لیے کہ بحمد اللہ یہ وقت کے ذہنی و فکری تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے اور قلب و روح کے تغذیہ و تقویت کا بھی پورا سامان رکھتی ہے،

---

[1] ان کیسٹوں کے پھیلاؤ کی وسعت کا کسی قدر اندازہ دو واقعات سے ہو سکتا ہے جو راقم کے حالیہ دورۂ امریکہ اور سفرِ بھارت کے دوران پیش آئے۔ (۱) سیراکیوز (امریکہ) میں جماعتِ اسلامی ہند کے قیم جناب محمد فضل کے صاحبزادے ڈاکٹر عمر فضل سے ملاقات ہوئی تو اثنائے گفتگو میں ایک اسلامی تحریک کے سربراہ کا ذکر آگیا، میں نے ایسے ہی کہہ دیا کہ میں نے سنا ہے کہ وہ میرے کیسٹ بہت سنتے ہیں تو عمر فضل صاحب کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے: "آپ کے کیسٹ کون نہیں سنتا، اور کس کے پاس نہیں ہیں"۔ (۲) حیدرآباد دکن میں اکتوبر ۱۹۸۹ء کی پندرہ، سولہ اور سترہ تاریخوں کو گاندھی بھون کے پرکاشم ہال میں جو خطبات راقم نے "امتِ مسلمہ کا ماضی، حال اور مستقبل" کے موضوع پر دیئے ان کے کیسٹ روز کے روز تیار ہو رہے تھے، اور پہلے دن کے کیسٹ اگلے روز بک جاتے تھے۔ آخری روز معلوم ہوا کہ گزشتہ روز کے خطاب کے سات سو کیسٹ تیار ہو سکے تھے جو سب کے سب بک گئے، اور مانگنے والے ابھی باقی تھے لہٰذا بہت سے حضرات محروم رہ گئے! فللہ الحمد والمنۃ!

اگرچہ سب کچھ ہے محض اسیؐ کی دین، اور اس کا کرم ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

تعلّم و تعلیمِ قرآن کی جس تحریک میں راقم الحروف نے اپنی حیاتِ مستعار کے پچیس سال بفضلِ ایزدی بالکل اسی کیفیت کے ساتھ لگائے ہیں جسے انگریزی ضرب المثل میں شمع کو دونوں طرف سے جلانے سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کے مستقبل کے ضمن میں راقم کی 'رجائیت' کی دوسری اساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت و رحمت سے گزشتہ دس سال کی مساعی کے نتیجے میں ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک جماعت تیار ہو چکی ہے جو توفیق و تیسیرِ خداوندی اس شمع کو روشن رکھنے اور اس تحریک کو آگے بڑھانے کی صلاحیت سے قابلِ اطمینان حد تک بہرہ ور ہو چکے ہیں ——— لہٰذا امّید واثق ہے کہ ان شاء اللہ العزیز اس شمع کی روشنی کم نہیں ہوگی بلکہ اس کی آب و تاب اور ضیا پاشیوں میں یَوْمًا فَیَوْمًا اضافہ ہوتا چلا جائے گا ——— اور اگرچہ راقم ان سب نوجوانوں کو بیٹوں ہی کی طرح عزیز رکھتا ہے، تاہم "نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ" کے مصداق یہ راقم پر اللہ تعالیٰ کے 'فضل بر فضل' کا مظہر ہے کہ ان میں راقم کے اپنے تین صلبی بیٹے بھی شامل ہیں[1] "ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ" (یوسف : ۳۸)

---

[1] میرے فرزندِ اکبر ڈاکٹر عارف رشید سلمہٗ نے تو بحمد اللہ میرے 'اتباع' کا حق ادا کر دیا کہ بالکل میرے ہی مانند ایم بی بی ایس پاس کرکے میڈیسن کی لائن تج دی اور ہمہ تن و ہمہ وقت اسی تحریک تعلّم و تعلیم قرآن سے منسلک ہو گئے، اور اس وقت قرآن اکیڈمی کے جملہ انتظامی امور کی نگرانی کے علاوہ ہر ہفتے چار مقامات پر درسِ قرآن کے علاوہ ایک جامع مسجد میں جمعہ کا خطبہ بھی دے رہے ہیں۔ اور اس طرح گویا جوابِ شکوہ، کے اس شعر کا مصداق بن گئے ہیں کہ ؎ باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو، پھر پسر لائقِ میراثِ پدر کیونکر ہو! دوسرے بیٹے حافظ عاکف سعید سلمہٗ نے بھی ایم اے فلسفہ کرنے کے بعد اسی تحریک سے ہمہ تن و ہمہ وقت وابستگی اختیار کر لی۔ چنانچہ بحمد اللہ درس بھی دے رہے ہیں اور 'میثاق' اور 'حکمتِ قرآن' کی ادارت کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

واضح رہے کہ یوں تو گزشتہ ربع صدی کے دوران جن لوگوں نے راقم کے دروس کے ذریعے اُس کے فکرِ قرآنی کو کما حقہٗ اخذ کیا، اور بالخصوص مطالعۂ قرآنِ حکیم کے منتخب نصاب کے ذریعے دین کے ہمہ گیر تصور کے ساتھ ساتھ فرائض دینی کے جامع تصور کو بھی علیٰ وجہ البصیرت قبول کیا اُن کی تعداد ہزاروں میں ہے ——— اور ان میں ایک خاصی قابلِ لحاظ تعداد ایسے حضرات کی بھی ہے جو بوجوہ راقم کے ساتھ کسی تنظیمی سلسلے میں منسلک نہیں ہوئے لیکن اپنے طور پر قرآنِ حکیم کے اس انقلابی فکر کو عام کر رہے ہیں۔ چنانچہ گاہے گاہے ایسے حضرات سے ملاقات ہوتی ہے تو ایک قلبی مسرت اور روحانی سکون حاصل

(گزشتہ سے پیوستہ)

علاوہ طباعت واشاعت کے جملہ کاموں کی نگرانی بھی اُن کے فرائض میں شامل ہے۔ مزید برآں قرآن کالج میں فلسفہ کی تدریس بھی کر رہے ہیں۔ تیسرے بیٹے حافظ عاطف وحید اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم ایس سی اکنامکس امتیازی حیثیت میں پاس کر کے قرآن کالج میں بحیثیت لیکچرر کام کر رہے ہیں چوتھے اور سب سے چھوٹے بیٹے عزیزم آصف حمید ابھی ایف ایس سی میں زیرِ تعلیم ہیں اور اگرچہ فی الحال کھیل کود کی جانب زیادہ رجحان رکھتے ہیں تاہم اللہ کے فضل وکرم سے امید ہے کہ وہ بھی مجھے ان کے بارے میں بھی محروم نہیں رکھے گا! (ویسے یہ عجیب اتفاق ہے کہ عزیزم آصف کی ولادت میری عین چالیسویں سالگرہ کے دن ہوئی یعنی ۲۶ اپریل ۷۲ء کو، اور اُن کی مزید "خوش نصیبی" کی علامت یہ ہے کہ اُس روز ماہ ربیع الاوّل کی پاکستان کے حساب سے گیارہ اور عالمِ عرب کے حساب سے بارہ تاریخ تھی۔)

اپنی اولادِ نرینہ کے بارے میں ایک اور راز کی بات بھی عرض کر ہی دوں۔ راقم کو اللہ نے جب بھی حرم کی حاضری کا موقع عنایت فرمایا، طواف کی مستقل دعاؤں میں یہ دعا ہمیشہ شامل رہی کہ "اے ربّ! تیرے علم میں مجھے جو بھی نسبت (خواہ ہزار میں ایک، خواہ لاکھ میں ایک) حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے ہے، وہی نسبت میرے بیٹوں کو حضرت مجددؒ کے عالی قدر صاحبزادوں اور شاہ صاحبؒ کے جلیل القدر فرزندوں کے ساتھ عطا فرما دے ——— وَلَا تَجْعَلْنِی بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا!" اور مجھے اپنے ربّ کی بے پایاں رحمت سے امید واثق ہے کہ وہ مجھے مایوس ومحروم نہیں کرے گا!

ہوتا ہے[1]۔ اسی طرح ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان بھی کم از کم پچاس کی تعداد میں ہیں جنہوں نے قرآن اکیڈمی کی دو سالہ تدریسی سکیم سے منسلک ہو کر عربی گرامر اور ترجمۂ قرآن کے ساتھ ساتھ قرآن کے اس انقلابی فکر کی باضابطہ تحصیل کی ہے ـــــ تاہم ابھی ایسے نوجوان جنہوں نے اس تعلّم و تعلیمِ قرآن ہی کو ایک مشن کی حیثیت سے اختیار کر لیا ہو بیس سے زیادہ نہیں ہے ـــــ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امیدِ قوی ہے کہ اس تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو گا اور اس طرح اس خواب کی عملی تعبیر بھی سامنے آجائے گی جو مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۵ء میں دیکھا تھا۔ یعنی:

> "اگر ایک شخص مسلمانوں کی تمام موجودہ تباہ حالیوں اور بدبختیوں کی علتِ حقیقی دریافت کرنا چاہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دے کہ صرف ایک ہی علتِ اصلی ایسی بیان کی جائے جو تمام علل و اسباب پر حاوی اور جامع ہو تو اس کو بتایا جا سکتا ہے کہ علماء حق و مرشدینِ صادقین کا فقدان اور علماء سوء و مفسدین دجالین کی کثرت ـــــ رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا،
>
> اور پھر اگر وہ پوچھے کہ ایک ہی جملہ میں اس کا علاج کیا ہے؟ تو اس کو امام مالک کے الفاظ

---

[1] اس کی ایک دلچسپ مثال قارئین کے لیے مفید ہو گی۔ ایک روز میں اسلام آباد ایئرپورٹ کے لاؤنج میں پرواز کی روانگی کے انتظار میں تھا کہ ایک عمدہ لباس میں ملبوس صاحب آ کر میری برابر والی نشست پر بیٹھ گئے، اور مجھ سے سوال کیا: "آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" میں نے عرض کیا کہ صورت تو کچھ شناسا سی معلوم ہوتی ہے۔ اس پر انہوں نے تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک سرکاری محکمے میں بہت اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں اور بہت عرصہ قبل میرے مسجد خضراء سمن آباد کے درس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے اپنا بریف کیس کھول کر مجھے منتخب نصاب کے ایک درس کے عربی متن کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں دکھائیں اور بتایا کہ "میرا معمول ہے کہ جب بھی کہیں سرکاری دورے پر جاتا ہوں اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے بعد لوگوں کو جمع کر کے آپ کے مرتب کردہ نصاب کے اسباق کا درس دیتا ہوں اور یہ سلسلہ میں نے کئی سال سے شروع کر رکھا ہے!" ـــــ اب ظاہر ہے کہ یہ توضیح "سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں!" کے مصداق صرف ایک مثال ہے!

میں جواب ملنا چاہیے کہ "لَا یَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا" یعنی امتِ مرحوم کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہو سکے گی، تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے اصلی و حقیقی معارف کی تبلیغ کرنے والے مرشدین صادقین پیدا کیے جائیں"

——— (ماخوذ از 'البلاغ' جلد اوّل، شمارہ اوّل مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء)

مولانا آزاد مرحوم نے اسی مقصد کے لیے ۱۹۱۵ء میں کلکتہ میں 'دارالارشاد' قائم کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ اُن کی دوسری سیاسی و ملّی سرگرمیوں نے انہیں اُس کی جانب توجہ کرنے کی فرصت نہ دی اور 'دارالارشاد' جلد ہی ع "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند!" کی تصویر بن گیا۔ یادش بخیر، لگ بھگ بیس بائیس برس بعد 'قرآن اکیڈمی' کے دو سالہ تدریسی کورس سے ملتے جلتے پروگرام کے تحت علامہ اقبال کی تجویز کے مطابق اُن کے ایک معتقد اور دین و ملت کے دردمند شخص چوہدری نیاز علی خاں نے پٹھانکوٹ کے قریب سرناریو سے سٹیشن سے متصل 'دارالاسلام' قائم کیا تھا لیکن مشیتِ الٰہی سے علامہ اقبال اس ادارے کے قیام کے فوراً بعد انتقال فرما گئے اور تعمیر شدہ عمارات اگرچہ بعض دوسرے مفید مقاصد میں استعمال ہوئیں لیکن علامہ مرحوم کے اصل تصوّر کے مطابق کام کا آغاز بھی نہ ہو سکا۔

راقم کن الفاظ میں اللہ کا شکر ادا کرے کہ اُس نے ۱۹۶۷ء میں 'قرآن اکیڈمی' کا جو خواب دیکھا تھا، اُس کے لیے ۱۹۷۲ء میں ایک باضابطہ 'انجمن' قائم ہو گئی، ۱۹۷۶ء میں اُس کی تعمیر کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، ۱۹۸۲ء میں 'قرآن اکیڈمی فیلوشپ اسکیم' کا آغاز ہوا، ۱۹۸۴ء میں 'دو سالہ تدریسی اسکیم' شروع ہوئی، اور ۱۹۸۷ء میں قرآن اکیڈمی کی کوکھ سے 'قرآن کالج' برآمد ہو گیا ——— راقم کو تو اس میں بھی جھلک نظر آتی ہے اُس تمثیلِ قرآنی کی کہ:

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ (الفتح: ۲۹)

ویسے راقم کے نزدیک یہ اصلاً علامہ اقبال اور مولانا آزاد ہی کے خوابوں کی تعبیر ہے جو اللہ نے اپنے اس بندۂ ناچیز کے ذریعے ظاہر فرمائی: لہٰذا "الفضلُ للمتقدّم" کے مطابق اجر و ثواب میں بڑا حصہ انہی کا ہے!

اور اب کچھ باتیں پیشِ نظر تالیف کے مشمولات کے بارے میں!

جیسے کہ 'انتساب' سے ظاہر ہے یہ تالیف میں نے اصلاً اُن نوجوانوں ہی کے لیے مرتب کی ہے جو حدیثِ نبویؐ: "خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ" کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنالیں۔ ان شاء اللہ العزیز ایسے نوجوانوں کو اس کے ذریعے اُن موجود الوقت علمی و فکری اور تہذیبی و ثقافتی ظروف و احوال کا فہم و شعور بھی حاصل ہو جائے گا جن میں انہیں 'دعوت الی القرآن' کا فریضہ سرانجام دینا ہے' اور ع "اپنی خودی پہچان" کے مصداق اپنی اُس نسبتِ عالیہ کا ادراک بھی ہو جائے گا جو خدمتِ قرآن کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے کے ناطے انہیں گزشتہ تین صدیوں کے اُن اعاظمِ رجال سے حاصل ہو گئی ہے جنہوں نے 'دعوت رجوع الی القرآن' کے شجرۂ طیبہ کی آبیاری کی ہے —— مزید برآں اللہ کے ایک بندۂ حقیر کی سرگزشت کے حوالے سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ اگر طلبِ صادق اور عزمِ راسخ ہو تو اللہ تعالیٰ ع "ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں" کے مصداق کیسی کیسی عنایتیں فرماتے ہیں' اور اپنے اس حتمی وعدے کے مطابق کہ "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" (العنکبوت: ۶۹) کیسے کیسے راستے کھولتے چلے جاتے ہیں۔ اور "وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ" (الحج: ۴۰) کی کیسی کیسی صورتیں سامنے آتی ہیں!

بنا بریں یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے جن میں متذکرہ بالا معنوی ترتیب کے علاوہ ایک تاریخی ترتیب بھی ہے' یعنی حصہ اوّل میں میری وہ تحریر شامل ہے جو میں نے ۱۹۶۷ء میں سپردِ قلم کی تھی' حصہ دوم میری اُن تحریروں پر مشتمل ہے جو ۷۶-۱۹۷۵ء کے دوران مختلف اوقات میں ضبطِ تحریر میں آئیں'[1] جبکہ حصہ سوم میں وہ تحریر شامل ہے جو اوائل ۱۹۸۹ء میں مرتب ہوئی۔

ان میں سے پہلی تحریر یعنی "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" میری پوری قرآنی تحریک اور جملہ دعوتی و تنظیمی مساعی کے لیے بمنزلہ اساس ہے۔ چنانچہ اسی کو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اور قرآن اکیڈمی کے منشور (MANIFESTO) کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اب تک ایک

---

[1] یہ مضامین چونکہ جُوں کے تُوں شائع کیے جا رہے ہیں لہٰذا ان میں بعض اُن اشخاص کا ذکر جو اب مرحومین کی فہرست میں شامل ہو چکے ہیں' زندہ شخصیتوں کے انداز میں کیا گیا ہے۔ قارئین اس معاملے کو نوٹ کر لیں تاکہ دورانِ مطالعہ اُلجھن نہ ہو!

کتابچے کی صورت میں اردو میں کم و بیش پچاس ہزار اور انگریزی میں لگ بھگ پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ چونکہ راقم کے قلم کے رواں نہ ہونے کے باعث بہت مختصر بھی ہے اور کسی قدر مغلق بھی، بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ یہ محض اشارات پر مشتمل ہے لہٰذا راقم نے بارہا خود اس کا درس متعدد قرآنی تربیت گاہوں اور قرآن اکیڈمی کی مختلف کلاسوں میں دیا ہے ——— الحمدللہ کہ حال ہی میں اس مختصر تحریر کی توضیح و تفصیل پر مشتمل راقم کے لیکچرز کا ویڈیو بھی تیار ہو گیا ہے جو تین تین گھنٹے کے تین کیسٹوں میں مکمل ہو سکا ہے!

حصۂ اوّل میں دوسری تحریر پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی ہے جو موصوف نے میری تحریر کی تحسین اور تائید و توثیق کے لیے لکھی تھی۔ جس سے میری تحریر مزید مبرہن بھی ہو جاتی ہے اور اس کے بعض خلا بھی پُر ہو جاتے ہیں! بالخصوص یورپ میں الحاد و مادہ پرستی کے فروغ اور فی الجملہ مذہب دشمنی کے اسباب بالکل نکھر کر سامنے آجاتے ہیں!

کتاب کا حصۂ دوم چار ابواب پر مشتمل ہے:

ان میں سے پہلا باب نہایت مختصر ہے یعنی کُل چھ صفحات پر مشتمل، لیکن یہ میری محبوب ترین تحریروں میں سے ہے۔ اس لیے کہ راقم کا گمان ہے کہ غالباً آج تک کسی نے اس حقیقت کی جانب توجہ نہیں کی کہ تاریخ اسلام کے قرنِ اوّل ہی میں بعض فطری اور منطقی اسباب کے نتیجے میں توجہات قرآنِ حکیم کی بجائے بعض دوسری چیزوں کی جانب منعطف ہو گئی تھیں اور یہی عمل ہے جو بعد کے ادوار میں تدریجاً بڑھ کر "مہجوریٔ قرآن" اور "قرآن کو چھوڑ دینے" کی اس کیفیت پر منتج ہوا جس کی نشاندہی علامہ اقبال اور حضرت شیخ الہندؒ نے کی! ——— لہٰذا اس کتاب کے ہر قاری سے میری یہ تاکیدی گزارش ہے کہ ان صفحات کو توجہ سے پڑھیں اور ان میں قرآن، ایمان اور جہاد کے مابین جو منطقی ربط بیان ہوا ہے اس پر خصوصی غور کریں۔

دوسرا باب بھی غایتِ اختصار کے باوصف ہندوستان میں اسلام کی پوری تاریخ کا اجمالی خاکہ پیش کر دیتا ہے جس سے ملّتِ اسلامیہ ہندیہ کے بحرِ محیط میں چلنے والی مختلف علمی و فکری اور تہذیبی و ثقافتی رَوؤں کی شناخت بھی ہو جاتی ہے اور ان کے تاریخی پس منظر سے آگاہی بھی ہو سکتی

بھی تجدیدی سعی وجہد کے لیے شرطِ لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔ مزید برآں اس میں امّتِ مسلمہ کی تاریخ کے الفِ ثانی کی پہلی دو صدیوں کی تجدیدی مساعی کا مختصر جائزہ بھی آگیا ہے، اور بحمداللہ حضرت مجدّد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ اور امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے تجدیدی کارناموں کے ساتھ ساتھ اُن کی اپنی شخصیتوں اور رجحانات کا تقابلی مطالعہ بھی بہت خوبصورتی سے آگیا ہے۔ ان میں سے چونکہ 'دعوت رجوع الی القرآن' کا نقطۂ آغاز شاہ ولی اللہؒ کی ذاتِ بابرکات ہے لہٰذا اُن کی 'قرآنی خدمات' کے اجمالی تعارف کے لیے شیخ محمد اکرام صاحب کی 'رودِ کوثر' سے ایک طویل اقتباس بھی اس باب کی زینت ہے۔

تیسرا باب تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری کے دوران 'دعوت رجوع الی القرآن' کی پیش قدمی کے جائزے کے علاوہ ہندوستان میں انگریزوں کے ورود کے بعد ملّتِ اسلامی کے لیے جو نئے مذہبی واعتقادی اور ملّی وسیاسی مسائل پیدا ہوئے ان کے مختصر مگر جامع جائزے پر مشتمل ہے۔ اس ضمن میں جو نہایت قیمتی بلکہ 'نادر' معلومات اس باب میں درج ہیں اُن کے لیے راقم پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کا مرہونِ منّت ہے، چنانچہ راقم خود بھی اُن کے لیے دست بدعا ہے اور قارئین سے بھی گزارش ہے کہ اُن کے حق میں دعائے خیر کریں۔

چوتھا باب خود راقم الحروف کی خوش نصیبیوں اور 'محرومیوں' کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ جس میں راقم نے ایک جانب اپنی اِس خوش بختی کی تفصیل بیان کردی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے لیے اپنے خصوصی فضل وکرم سے ایسے حالات پیدا فرمادیئے کہ اُسے علم وفہمِ قرآنی کے چار چشموں سے سیراب ہونے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ اس کے ضمن میں راقم نے اپنے 'فکرِ قرآنی' کے چار ابعاد (FOUR DIMENSIONS) کی تفصیل بیان کردی ہے۔ اس لیے کہ راقم کے درسِ قرآن کی مقبولیت کا راز دراصل اسی میں مضمر ہے کہ اس میں ابوالکلام آزاد اور ابوالاعلیٰ مودودی کی دعوتِ حرکت وجہاد کی للکار بھی موجود ہے، مولانا حمیدالدین فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے تدبّر وتعمّق کا عنصر بھی شامل ہے، پھر ڈاکٹر محمد اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین کے سائنسی اور فلسفیانہ فکرِ قرآنی کی خوشہ چینی بھی ہے، اور سب سے بڑھ کر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے تمسّک بالاسلاف کا تحفّظ اور تصوّفِ قرآنی کی چاشنی بھی موجود ہے ——— (عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ میرے فکری اسلاف میں دو شیخین

ہیں، تو دو ہی 'الوین' ہیں، اسی طرح دو ہی 'دکتورین' ہیں اور دو ہی وہ ہیں جن کے ناموں کے لاحقے یائے نسبتی کی بنیاد پر مشابہ ہیں!)

اس باب کا ایک حصّہ بعض تلخ یادوں پر مشتمل ہے۔ بظاہر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ اُن کو حذف کر دینے سے کتاب کی افادیت میں کوئی کمی نہ ہوتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس انجمن اور اکیڈمی کے تحت تحریک تعلّم و تعلیمِ قرآن کو آگے بڑھانا مقصود ہے اُس کے داعی اور مؤسّس کے بارے میں ممکنہ اشکالات کا حل، اور بعض بزرگوں کے ضمن میں "وصل و فصل" کی داستان کے حقائقِ واقعی کی صراحت و وضاحت خود تحریک کے مصالح کے اعتبار سے ناگزیر ہے! اور بحمد اللہ راقم اس پر مطمئن ہے کہ اس تذکرے میں اُس نے ان بزرگوں کے ادب کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے اور کہیں توہین آمیز انداز اختیار نہیں کیا!

کتاب کا حصّہ سوم حفیظ کے اس شعر کے مصداق کہ ؎ "تکمیل اور تدوینِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصّہ ہے نصف صدی کا قصّہ ہے دو چار برس کی بات نہیں!" گزشتہ ربع صدی کے دوران تحریک تعلّم و تعلیمِ قرآن کے ضمن میں جو بھی کچھ راقم الحروف سے بن آیا ہے اُس کی رُوداد پر مشتمل ہے۔ اس کا اکثر و بیشتر حصّہ لگ بھگ ایک سال قبل راقم الحروف نے خود مرتب کیا تھا جو 'حکمتِ قرآن' کی اشاعت بابت مارچ اپریل ۱۹۸۹ء میں شائع بھی ہو گیا تھا۔ اس میں راقم نے اپنی جدوجہد اور مساعی کے ابتدائی مراحل کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے تاکہ خدمتِ قرآن کی اس پاکیزہ وادی کے نَووارِدوں کے لیے نشاناتِ راہ واضح ہو جائیں۔ اور ان پر یہ حقیقت کماحقہٗ منکشف ہو جائے کہ

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے!

اور ؎

طے می شود ایں رہ بدرخشیدنِ برقے ما بے خبراں منتظرِ شمع و چراغیم!

حصّہ سوم کا آخری جزو عزیزم ڈاکٹر عارف رشید سلمہٗ کا مرتب کردہ ہے جس میں اس تحریک تعلّم و تعلیمِ قرآن کے اہم ترین ادارے یعنی 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' کی اٹھارہ سالہ کارکردگی کی ایک جھلک بنیادی طور پر اعداد و شمار کے حوالے سے پیش کی گئی ہے۔

آخر میں چند ضمیمے شاملِ کتاب ہیں۔ جن سے بیک نظر معلوم ہو جاتا ہے کہ گزشتہ بیس سالوں کے دوران، اللہ کی توفیق و نصرت سے، راقم نے اس دعوتِ قرآنی کے لیے کتنی تندہی اور جانفشانی سے کام کیا ہے اور اس کے لیے کتنی شدید مشقت جھیلی ہے، حالانکہ راقم کی صحت جسمانی کبھی قابلِ رشک نہیں رہی۔ ایف ایس سی کی تعلیم کے زمانے تک راقم نے نہ کبھی کسی کھیل میں حصہ لیا تھا نہ کسی تقریری مقابلے یا مباحثے (DEBATE) میں۔ بلکہ راقم ایک منحنی جسم اور خاموش طبع کا حامل نوجوان تھا ــــ لیکن پھر جیسے ہی دعوتِ اسلامی اور تحریکِ قرآنی کا داعیہ پیدا ہوا حیرت ہوتی ہے کہ قوتِ کار اور تحمل و برداشت کے کیسے کیسے سوتے اسی منحنی اور کمزور جسم کے اندر سے اُبل پڑے ــــ میڈیکل کالج کے پانچ سالوں کے دوران راقم نے اسلامی جمعیتِ طلبہ میں جس محنت و مشقت کے ساتھ کام کیا اب اگر کبھی اس کی یاد آتی ہے تو خود مجھے حیرت ہوتی ہے ــــ اسی طرح وسط ۱۹۶۵ء میں لاہور منتقل ہونے کے بعد سے ۱۹۷۲ء میں قیامِ انجمن تک راقم نے "وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا" کے مصداق خالص 'فرد' کی حیثیت سے بالکل یکہ و تنہا جو مشقت جھیلی اس کی مختصر سی روداد راقم نے اپنے بعض ذاتی اور خاندانی کوائف کے ضمن میں سپردِ قلم کی تھی، جو تاحال نامکمل ہے، تاہم جتنا حصہ شائع ہو چکا ہے اس سے بھی جو نقشہ سامنے آتا ہے اس پر خود مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ع

"ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!"

قیامِ انجمن کے بعد سے اب تک کے اٹھارہ سالوں کے دوران راقم کی مصروفیت کا دھندلا سا نقشہ سامنے لانے کے لیے ان ضمیموں میں پانچ پانچ سال کے وقفوں سے شائع ہونے والی بعض رپورٹوں کے اقتباس دیئے جا رہے ہیں۔ واضح رہے کہ ہمارے یہاں رپورٹوں کی تدوین کا کوئی مستقل اور باضابطہ نظام نہیں رہا۔ کبھی اتفاق ہی سے کوئی روداد مرتب ہو کر شائع ہو جاتی تھی۔ ان میں سے بعض جن پر اتفاقاً ہی نظر پڑ گئی "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر ہدیۂ قارئین ہیں:

چنانچہ پہلا ضمیمہ جنوری ۷۲ء تا جون ۷۲ء حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن کراچی کی روداد پر مشتمل ہے جو رفیقِ محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے مرتب کی تھی اور 'میثاق' جولائی ۷۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ (واضح رہے کہ کراچی میں کام کا آغاز ۷۱ء ہی میں ہوا تھا)

دوسرا ضمیمہ 'میثاق' مارچ ۱۹۷۷ء میں شائع شدہ "رفتارِ کار" پر مشتمل ہے جس میں اواخر دسمبر ۷۶ء

یا اوائل فروری ۱۹۸۲ء کی کراچی کی رُوداد برادرم قاضی عبدالقادر صاحب کی مرتب کردہ ہے اور لاہور، چنیوٹ اور سکھر کی سرگرمیوں کا جائزہ شیخ جمیل الرحمٰن صاحب ہی کا تحریر کردہ ہے۔

تیسرا ضمیمہ 'میثاق' فروری ۱۹۸۲ء کے 'تذکرہ و تبصرہ' سے ماخوذ ہے جو خود راقم ہی نے تحریر کیا تھا۔ یہ ۲۸ دسمبر ۱۹۸۱ء سے ۲۸ جنوری ۱۹۸۲ء تک کے اسفار کی تاریخ وار رُوداد ہے جس کو اب تو پڑھنے ہی سے سر چکرانے لگتا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ کبھی میرے شب و روز اس طرح کی "گردشِ مدام" کی صورت اختیار کر گئے تھے!

ان تینوں ضمیموں کی اشاعت سے اصل مقصود تحریک تعلّم و تعلیم قرآن سے وابستہ ہونے والے نوجوانوں کی ہمت افزائی ہے کہ اگر مجھ ایسے کمزور اور مریض انسان کو اللہ اتنی ہمت عطا فرما سکتا ہے تو اُن کو کیوں نہ عطا فرمائے گا۔ اُس کی جناب سے تو ہر دم یہ ندا آتی ہے۔

یَا بَاغِیَ الْخَیْرِ اَقْبِلْ ـــــ وَ ـــــ یَا بَاغِیَ الشَّرِّ اَدْبِرْ!

گویا ؎ ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں — راہ دکھلائیں کسے، رہرو منزل ہی نہیں!

آخری ضمیمہ قرآن اکیڈمی کے دو سالہ تدریسی کورس کے پہلے گروپ کے سال اوّل کی رُوداد پر مشتمل ہے۔ یہ رُوداد بھی خود راقم الحروف ہی نے تحریر کی تھی اور مئی ۱۹۸۵ء کے 'حکمتِ قرآن' میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی اشاعت سے مقصد یہ ہے کہ "نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی" کے مصداق تصویر کا یہ دوسرا رُخ بھی نگاہوں کے سامنے آجائے کہ اگر کام کرنے کے لیے کمر ہمت کس لی جائے تو اسی بگڑے ہوئے معاشرے اور ملحدانہ و مادّہ پرستانہ ماحول سے سعید رُوحیں نکل آتی ہیں۔ اور نہ مردانِ کار کی کمی رہتی ہے نہ وسائل و ذرائع کی۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ع "شرطِ اوّل قدم ایں است کہ مجنوں باشی" کے مصداق انسان اللہ کی تائید و نصرت پر بھروسہ کرتے ہوئے دیوانہ وار کام شروع کر دے۔

آخر میں جوانوں کے حق میں علامہ اقبال کی اس دُعا اور تمنا کے ساتھ کہ ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے!

اور سے

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر! اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!
مرے قافلے میں لُٹا دے اسے! لُٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے!!

اور خود اپنے اور اُن تمام لوگوں کے حق میں جو اللہ کے دین کی نصرت اور اس کی کتابِ عزیز کی خدمت میں مصروف ہوں اس دعا کے ساتھ کتاب ہدیۂ قارئین کرتا ہوں کہ:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا
مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ
اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ وَاجْعَلْهُ لَنَا
اِمَامًا وَّ نُوْرًا وَّهُدًى وَّرَحْمَةً ـــ اَللّٰهُمَّ
ذَكِّرْنَا مِنْهُ مَا نَسِيْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْهُ مَا جَهِلْنَا وَارْزُقْنَا
تِلَاوَتَهٗ اٰنَاءَ اللَّيْلِ وَاٰنَاءَ النَّهَارِ

وَاجْعَلْهُ لَنَا حُجَّةً يَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ
۲۱ دسمبر ۸۹ء

حصّہ اوّل

دعوت رجوع الی القرآن

موجودہ عالمی تہذیب کے تناظر میں

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ : کرنے کا اصل کام

فکرِ مغرب کی اساس اور اُس کا تاریخی پس منظر

باب اوّل

اِسلام کی نشاۃِ ثانیہ کرنے کا اصل کام

قرآنِ حکیم کی اساس پر تجدیدِ ایمان اور احیاءِ علم کی نئی تحریک!

فرمانِ نبویؐ

مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْإِسْلَامَ فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّينَ دَرَجَةٌ وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ

رواہُ الدارمیؒ عن الحسن مرسلاً ورواہُ ایضاً الطبرانیؒ فی الاوسطِ عن ابن عباسٍ وکذا الخطیبُ عنہُ مرفوعاً

(لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح)

- فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلاء
- بنیادی نقطۂ نظر
- عالمِ اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش
- مدافعت کی اوّلین کوششیں اور اُن کا ماحصل
- علومِ عمرانی کا ارتقاء
- اسلامی نظامِ حیات کا تصور اور بیسویں صدی عیسوی
- کی اسلامی تحریکیں
- تعبیر کی کوتاہی
- 'احیائے اسلام' کی شرطِ لازم: 'تجدید ایمان'
- کرنے کا اصل کام
- عملی اقدامات

فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلاء

موجودہ دور بجا طور پر مغربی فلسفہ و فکر اور علوم و فنون کی بالادستی کا دور ہے اور آج پورے کرۂ ارضی پر مغربی افکار و نظریات اور انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصورات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتداء آج سے تقریباً دو سو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی اور جو اس کے بعد مسلسل مستحکم ہوتے اور پروان چڑھتے چلے گئے۔ آج کی دنیا سیاسی اعتبار سے خواہ کتنے ہی حصّوں میں منقسم ہو تقریباً ایک ہی طرزِ فکر اور نقطۂ نظر پوری دنیا پر حکمران ہے اور بعض سطحی اور غیر اہم اختلافات سے قطع نظر ایک ہی تہذیب اور ایک ہی تمدن کا سکّہ پوری دنیا میں رواں ہے۔ کہیں کہیں منتشر طور پر کوئی دوسرا نقطۂ نظر اور طرزِ فکر اگر پایا بھی جاتا ہے تو اس کی حیثیت زندگی کی اصل شاہراہ سے ہٹی ہوئی پگڈنڈی سے زیادہ نہیں ہے۔ ورنہ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ جو طبقے قیادت و سیادت کے مالک ہیں اور جن کے ہاتھوں میں اجتماعی زندگی اور اس کے جملہ متضمنات کی اصل زمام کار ہے وہ سب کے سب بلا استثناء ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدن اور فلسفہ و فکر کا یہ تسلط اس قدر شدید اور ہمہ گیر ہے کہ بعض ان قوتوں کے نقطۂ نظر کا جائزہ بھی اگر دقتِ نظر سے لیا جائے جو مختلف ممالک میں مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف صف آراء ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مغرب کے اثرات سے بالکلیہ محفوظ نہیں ہیں اور خود ان کا طرزِ فکر بہت حد تک مغربی ہے۔

بُنیادی نقطۂ نظر

تہذیبِ جدید کی بُنیاد میں جو فکر کام کر رہا ہے وہ نہ تو کوئی ایک دن میں پیدا ہوگیا ہے اور نہ ہی کوئی سادہ اور بسیط شئے ہے بلکہ ان ڈیڑھ دو سو سالوں کے دَوران فلسفے کے کتنے ہی مکاتبِ فکر یورپ میں پَیدا ہوئے اور کتنے ہی زاویہ ہائے نگاہ سے انسانوں نے انسان اور انسانی زندگی پر غور و فکر کیا ـــــ لیکن اس پُورے ذہنی و فکری سفر کے دَوران ایک نقطۂ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پر اس پُورے فکر کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں 'خیالی' اور 'ماورائی' تصوّرات کے بجائے 'ٹھوس' حقائق و واقعات کو غور و فکر اور سوچ بچار کا اصل مرکز و محور ہونے کی حیثیّت حاصل ہے اور خدا کے بجائے کائنات' روح کے بجائے مادّہ اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصوّر کے بجائے حیاتِ دنیوی کو اصل موضوعِ بحث قرار دیا گیا ہے۔ خالص علمی سطح پر تو اگرچہ یہ کہا گیا کہ ہم خدا، روح اور حیات بعد الممات کا نہ اقرار کرتے ہیں نہ انکار لیکن اس عدمِ اقرار و انکار کا نتیجہ بہر حال یہ نکلا کہ یہ 'تصوّرات' رفتہ رفتہ بالکل خارج از بحث ہوتے چلے گئے اور انسان کے سارے غور و فکر اور تحقیق و تجسّس کا مرکز و محور کائنات' مادّہ اور حیاتِ دنیوی بن کر رہ گئے۔

انسان کو اللہ تعالےٰ نے جن بے پناہ قوّتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے وہ انہیں جس میدان میں بھی استعمال کرے نتائج بہر حال رونما ہوتے ہیں اور ہر ڈھونڈنے والا اپنے اپنے دائرۂ تحقیق و جستجو میں نئی دنیائیں تلاش کر سکتا ہے ـــــ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جس طرح کائنات کی عظمت و وسعت کے اعتبار سے مہرِ درخشاں کی حیثیّت و وقعت ایک "ذرّۂ فانی" سے زیادہ نظر نہیں آتی لیکن اگر ایک "ذرّہ فانی" کی حقیقت و ماہیت پر غور کیا جائے تو وہ بجائے خود "مہرِ درخشاں" کی عظمت و سطوت کا حامل نظر آتا ہے[1] اسی طرح حقیقت

---

[1] مہرِ درخشاں ذرّۂ فانی ـــــ ذرّۂ فانی مہرِ درخشاں (ٹگور)

[2] "لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں" اقبال

نفس الامری کے اعتبار سے چاہے خدا کے مقابلے میں کائنات، روح کے مقابلے میں مادّہ اور حیاتِ اخروی کے مقابلے میں حیاتِ دنیوی کیسے ہی حقیر اور کتنے ہی بے وقعت ہوں اگر نگاہوں کو انہی پر مرکوز کر دیا جائے تو خود ان کی وسعتیں بے کراں اور گہرائیاں اتھاہ نظر آنے لگتی ہیں۔

چنانچہ یورپ میں جب کائنات اور مادّہ تحقیق و جستجو کا موضوع بنے تو یکے بعد دیگرے ایسے ایسے عظیم انکشافات ہوئے اور بظاہر خفتہ و خوابیدہ مظاہرِ قدرت کے پردوں میں ایسی ایسی عظیم قوتوں اور توانائیوں کا سُراغ ملا کہ عقلیں دنگ اور نگاہیں چکا چوند ہو کر رہ گئیں اور علم و فن کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا ——— قدرت کے قوانین کی مسلسل دریافت، فطرت کی قوتوں کی پیہم تسخیر اور نت نئی ایجادات و اختراعات نے ایک طرف تو یورپ کو ایک ناقابلِ شکست قوت بنا دیا اور دوسری طرف مادّے کی یہ عظمت اور اس کی قوتوں کی یہ سطوت بجائے خود اس امر کی دلیل بنتی چلی گئیں کہ اصل قابلِ التفات شئی مادّہ ہے نہ کہ روح اور کائنات اور اس کے قواعد و قوانین ہیں نہ کہ خدا اور اس کی ذات و صفات! ———!!

عالمِ اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش

فطرت کی ان نو تسخیر شدہ قوتوں سے مسلح ہو کر مغرب جب مشرق پر حملہ آور ہوا تو دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیلاب کے مانند پورے کرۂ ارضی پر چھا گیا اور مشرقی اقوام اور ان کی عظیم حکومتیں اور سلطنتیں اس سیلاب میں ریت کے بچھے گھروندوں کی طرح بہتی چلی گئیں۔ اس سیلاب کا اوّلین شکار چونکہ مشرقِ قریب اور مشرقِ وسطیٰ تھے جہاں مسلمان آباد تھے، لہٰذا اس کی سخت ترین یورش اسلام اور اہلِ اسلام پر ہوئی اور چند ہی سالوں کے اندر اندر پورا عالمِ اسلام یورپ کے زیرِ نگیں ہو گیا۔

عالمِ اسلام پر مغرب کا یہ استیلاء دوگونہ تھا یعنی عسکری و سیاسی بھی اور ذہنی و فکری بھی لیکن یورپ کی اوّلین اور نمایاں ترین یورش چونکہ سیاسی تھی لہٰذا عالمِ اسلام میں جو ردِّ عمل اس کے خلاف

پیدا ہوا اس میں بھی اوّلاً اسی کا احساس غالب نظر آتا ہے۔ ملّتِ اسلامی کے اس تلخ احساس نے کہ یورپ نے کہیں براہ راست تسلّط اور قبضے اور کہیں انتداب و تحفظ و حمایت کے پردے میں اسے اپنا محکوم بنا لیا ہے اور اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اس کی وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ کر دیا ہے، بار بار دردانگیز نالوں کی صورت اختیار کی اور اپنے شاندار ماضی کی حسرت بھری یاد، اپنی "عمرِ رفتہ" اور عظمت و سطوتِ گزشتہ کے بازیافت کی شدید تمنّا اور "گردشِ ایام" کو پیچھے کی طرف لوٹانے کی بے پناہ خواہش نے کبھی سیّد جمال الدین افغانی کی سیماب وش شخصیت کا روپ دھارا اور کبھی تحریکِ خلافت کی صورت اختیار کی لیکن حقائق نے ہر بار جذبات و خواہشات کا منہ چڑایا۔ اور مغرب کی سیاسی بالادستی رفتہ رفتہ ایک تسلیم شدہ واقعہ کی صورت اختیار کرتی چلی گئی۔

اپنے سیاسی تسلّط کو مستحکم کرتے ہی یورپ نے دنیائے اسلام میں اپنے افکار و نظریات کا پرچار اور اپنے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبلیغ ——— یعنی ذہنی و فکری تسخیر کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ نگاہیں مغرب کی مادّی ترقّی سے پہلے ہی خیرہ ہو چکی تھیں، پھر زندہ قوموں میں ہمیشہ کچھ بنیادی انسانی اوصاف لازماً موجود ہوتے ہی ہیں۔ کچھ ان کی بنا پر مرعوبیت میں اضافہ ہوا۔ نتیجۃً ایک مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ مسلمانانِ عالم کے سوادِ اعظم نے مغربی افکار و نظریات کو جوں کا توں قبول کرنا اور حرزِ جاں بنانا شروع کر دیا ——— خالص فلسفہ و عمرانیات کے میدان میں تو چونکہ خود مغرب میں بے شمار مکاتبِ فکر موجود تھے لہٰذا ان کے بارے میں تو پھر بھی کسی قدر قیل و قال اور ردّ و قدح یا کم از کم ترجیح و انتخاب کا معاملہ کیا گیا لیکن سائنس چونکہ بالکل حتمی اور قطعی تھی اور اس کے نتائج بالکل محسوس و مشہود تھے اور اس میدان میں چون و چرا کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی لہٰذا اس کا استقبال بالکل وحیِ آسمانی کی طرح ہوا اور اس کے نتیجے میں غیر شعوری طور پر ملحدانہ نقطۂ نظر اور مادّہ پرستانہ طرزِ فکر رفتہ رفتہ عالمِ اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے ذہنوں میں سرایت کرتا چلا گیا۔ اور خدا کے بجائے کائنات، رُوح کے بجائے مادّے اور حیاتِ اُخروی کے بجائے حیاتِ دُنیوی کی اہمیت پوری امّتِ مسلمہ حتیٰ کہ اس کے خاصے دیندار اور مذہبی مزاج کے لوگوں کے

نزدیک بھی مسلّم ہوتی چلی گئی۔

مدافعت کی اوّلین کوششیں اور اُن کا ماحصل

مغربی فلسفہ و فکر کی اس یلغار کے مقابلے میں اسلام کی جانب سے مدافعت کی کوششیں بھی اس دوران میں ہوئیں اور بہت سے دردمند اور دین و مذہب سے قلبی لگاؤ رکھنے والے لوگوں نے ان کے تحفظ کی سعی کی۔ تحفظ و مدافعت کی یہ کوششیں دو طرح کی تھیں: ایک وہ جن میں محض تحفظ پر قناعت کی گئی۔ اور دوسری وہ جن میں مدافعت کے ساتھ ساتھ مصالحت اور کسر و انکسار کی روش اختیار کی گئی۔

پہلی قسم کی کوشش وہ تھی جسے بقول مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم اصحابِ کہف کی سنّت کا اتباع کہا جاسکتا ہے اور جس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ زندگی کی شاہراہ سے ہٹ کر کونوں کھدروں میں بیٹھ جاؤ اور اپنے دین و ایمان کو بچانے کی فکر کرو۔ اس قسم کی کوششیں اگرچہ بظاہر زی فراریت کا مظہر نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت ان کی اساس خالص حقیقت پسندی اور اس اعتراف پر تھی کہ مغرب کی اس یلغار کے کھلے مقابلے کی سکت اس وقت عالمِ اسلام میں نہیں ہے لہٰذا ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ یہ کہ اس سیلاب کے راستے سے ہٹ جایا جائے اور ہر طرح کے طعن و استہزا کو انگیز کرتے ہوئے ایمان کی سلامتی کی فکر کی جائے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کامیابی بھی تھوڑی بہت اگر کسی کو ہوئی تو صرف اسی طریق کار کے اختیار کرنے والوں کو ہوئی اور اس کے نتیجے میں امّت کے ایک حصّے کا ایمان بھی سلامت رہ گیا۔ مادّہ پرستی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں روحانیت کی شمعیں بھی کہیں کہیں جلتی رہ گئیں اور قال اللہ اور قال الرسولؐ کی صداؤں میں دین و شریعت کا ڈھانچہ بھی محفوظ رہ گیا ——— اس قسم کی کوشش کا مظہرِ اتم برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درس گاہ تھا لیکن واقعتہً اس کی حیثیت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی ———!

دوسری قسم کی کوششوں کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ ——— زمانے کا ساتھ بھی دیا جائے اور اسلام کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ اس مقصد کے تحت ایک طرف جدید افکار و نظریات کے صحیح و غلط اجزاء کو چھانٹ کر علیحدہ کیا جائے اور دوسری طرف اسلام کی ایسی جدید تعبیر کی جائے جس سے اس کی حقانیت ثابت ہو جائے۔

اس قسم کی کوششوں میں اوّل اوّل مرعوبیت اور شکست خوردگی کے اثرات بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ مغرب کی عقلیت پرستی (RATIONALISM) کی کسوٹی پر ہندو مصر کے کچھ نیم متکلم قسم کے لوگوں نے اسلامی اعتقادات و ایمانیات کو پرکھنا شروع کیا نتیجۃً اسلامی عقائد کی کتر بیونت اور اس کے ماورا۔ الطبعیاتی اعتقادات کی خالص سائنٹیفک توجیہیں شروع ہوئیں۔ ہندوستان میں سرسید احمد خاں مرحوم اور ان کے حلقہ اثر کے لوگوں اور مصر کے مفتی محمد عبدہٗ اور ان کے تلامذہ کی نیتیں کتنی بھی نیک رہی ہوں اور انہوں نے کتنے ہی خلوص کے ساتھ اس کی کوشش کی ہو کہ اسلام کی جدید تعبیر اور ماڈرن توجیہہ کر کے اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ زمانے کا ساتھ دے سکے اور اس کے حلقہ بگوش اسے اپنے ساتھ لے کر ترقی کی اس راہ پر گامزن ہو سکیں جسے یورپ نے اختیار کیا تھا لیکن یہ بہرحال امر واقعہ ہے کہ ان کی ان کوششوں سے دین و مذہب کی جان نکل کر رہ گئی اور مغرب کی مادہ پرستانہ ذہنیت کے تحت مذہب کا ایک کم و بیش لامذہبی ایڈیشن تیار ہوا۔ جس کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو صرف یہ کہ بہت سے ایسے لوگوں کو جو ذہن و فکر کے اعتبار سے ہی نہیں تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بھی خالص یورپین بن چکے تھے اپنے اوپر سے اسلام کا لیبل اتارنے کی ضرورت نہ پڑی اور وہ مسلم قومیت کے حلقے میں شامل رہ گئے اور دین کا یہ جدید ایڈیشن ان کی جانب سے مغرب کی خدمت میں بطور معذرت، پیش ہو گیا:

علومِ عمرانی کا ارتقاء

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، مغربی فکر کی اساس خدا، روح اور حیات

بعد المات کے عدمِ اقرار و انکار کے پردے میں درحقیقت انکار پر تھی۔ چنانچہ ایک طرف تو خدا کے بجائے کائنات اور رُوح کے بجائے مادّہ تحقیق و جستجو کا مرکز و محور بنے جس کے نتیجے میں سائنسی انکشافات و ایجادات و اختراعات کا سلسلہ شروع ہوا ——— اور دوسری طرف حیاتِ اُخروی سرے سے خارج از بحث ہوگئی، اور حیاتِ دنیوی گہرے غور و فکر اور شدید سوچ بچار کا موضوع بنی جس کے نتیجے میں مختلف عمرانی تصورات اور سیاسی و معاشی نظریات وجود میں آئے اور ان کی تالیف و تدوین سے مختلف نظام ہائے حیات پہلے علمی و فکری سطح پر اور پھر عالمِ واقعہ میں ظہور پذیر ہونا شروع ہوئے، چنانچہ ازمنہ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام (FEUDAL SYSTEM) کے تحت جو سیاسی و معاشی ڈھانچہ عرصۂ دراز سے دنیا میں رائج تھا اس کی جگہ سیاسی میدان میں قوم پرستی، آمریت اور جمہوریت کا رواج ہوا اور معاشی میدان میں سرمایہ داری اور سوشلزم برسرِکار ہوئے اور مختلف سیاسی و معاشی تحریکوں کا آغاز ہوا۔

اسلامی نظامِ حیات کا تصور اور بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں

عمرانیات کے میدان میں مغرب کے اس فکری ارتقاء یا بالالفاظِ صحیح افراط و تفریط کے دھکوں کا اثر عالمِ اسلام پر یہ پڑا کہ یہاں بھی لوگوں نے اسلام پر بطورِ نظامِ زندگی غور و فکر شروع کیا اور اسلام نے حیاتِ دنیوی کے مختلف شعبوں کے لیے جو ہدایات دی تھیں ان کی تالیف و ترتیب سے "اسلامی نظامِ حیات" کی تدوین ہوئی اور ساتھ ہی اس نظامِ زندگی کو دنیا میں عملاً نافذ کرنے کے لیے مختلف ممالک میں تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

بیسویں صدی عیسوی کی یہ اسلامی تحریکیں، جو انڈونیشیا سے مصر تک متعدد مسلمان ممالک میں تقریباً ایک ہی وقت میں شروع ہوئیں، بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں اور یہ کہنا بہت حد تک صحیح ہے کہ تقریباً ایک ہی تصورِ دین ان کی پُشت پر کام کر رہا ہے اور ایک ہی جذبہ ان میں سرایت کیے ہوئے ہے ——— پھر یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی

وجہ سے عالمِ اسلام میں اسلام پر کم از کم ایک بہتر ضابطۂ حیات ہونے کے اعتبار سے عمومی اعتماد میں اضافہ ہوا ہے۔ اور نوجوان نسل کے ذہنوں سے مغرب کی عام مرعوبیت میں بحیثیتِ مجموعی کمی واقع ہوئی ہے۔

مغربی فلسفہ و فکر اور تہذیب و تمدن سے مرعوبیت میں عمومی کمی کے کچھ دوسرے اسباب بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ مغرب کے سیاسی غلبے اور عسکری تسلّط کا جو سیلاب تیزی سے آیا تھا وہ نہ صرف یہ کہ رُک گیا ہے بلکہ مختلف ممالک میں قومی تحریکوں نے اس کا رُخ پھیر دیا ہے اور مغرب اپنی سیاسی بالادستی کی بساط رفتہ رفتہ تہہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہے[1]۔ اور اگرچہ تحفظ و حمایت کے پردے میں سیاسی بالادستی اور تعاون و امداد کے پردے میں معاشی تفوق و برتری کے بندھن ابھی باقی ہیں، تاہم تقریباً پورا عالمِ اسلام مغربی طاقتوں کی براہِ راست محکومی سے آزادی حاصل کر چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب و تمدن کا کھوکھلا پن تجربے سے ثابت ہو گیا اور خود مغرب میں محسوس کیا گیا کہ اس کی بنیاد غلط اور تعمیر کج ہے۔ خصوصاً مادہ پرستانہ الحاد جب اپنی منطقی انتہا کو پہنچا اور اس کی کوکھ سے سوشلزم اور کمیونزم نے جنم لیا اور انہوں نے انسانیت کی بچی کھچی اقدار کو بھی 'مٹھوس' معاشی مسئلے کے بھینٹ چڑھانا شروع کیا تو خود مغرب پریشان ہو گیا اور وہاں بھی نہ صرف انسانیت بلکہ دبی آواز میں روحانیت تک کا نام لیا جانے لگا۔ تیسرے یہ کہ، نہ صرف یہ کہ خود سائنس کی قطعیت اور حتمیت ختم ہو گئی اور کچھ نئے نظریات نے نیوٹن کی طبعیات اور اقلیدسی ہندسے کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں بلکہ خود مادّہ ٹھوس نہ رہا اور تحلیل ہو کر قوّتِ محض کی صورت اختیار کر گیا۔ چنانچہ مابعد الطبعیاتی عقائد کا اقرار نسبتاً آسان ہو گیا اور مذہب کو بحیثیتِ مجموعی کسی قدر سہارا ملا۔ چوتھے یہ کہ مختلف مسلمان ممالک میں جب آزادی اور خود اختیاری کے حصول کے لیے قومی تحریکیں اٹھیں تو چونکہ مسلم قومیت کی اساس بہر حال مذہب پر ہے لہٰذا جذبۂ قومی کی انگیخت کے لیے

---

[1] دولتِ برطانیہ نے جس طرح رفتہ رفتہ اپنی عظمت کی بساط لپیٹی ہے وہ تو اس دور کا ایک نہایت ہی عبرت آمیز واقعہ ہے۔

لامحالہ مذہبی جذبات کو اپیل کیا گیا جس سے احیائے اسلام کے تصور کو تقویت پہنچی۔

مندرجہ بالا اسباب وعوامل سے تقویت پاکر 'احیائے اسلام'، 'قیامِ حکومتِ الٰہیہ' اور 'نفاذِ نظامِ اسلامی' کی تحریکیں مختلف مسلمان ممالک میں برسرِکار ہوئیں جن میں قوت ووسعت اور جذبہ وامنگ کے اعتبار سے مصر کی 'الاخوان المسلمون' اہم ترتھی لیکن ایک ٹھوس اور مضبوط فکر کی حامل ہونے کے اعتبار سے برِصغیر پاک وہند کی 'جماعتِ اسلامی' کو نمایاں مقام حاصل تھا۔

یہ تحریکیں تقریباً ثلث صدی[1] سے مختلف مسلمان ملکوں میں برسرِعمل ہیں اور ملتِ اسلامی کی نوجوان نسل کا ایک خاصا قابلِ ذکر حصہ ان کے زیرِ اثر آیا ہے لیکن عملاً ان میں سے کسی کو کوئی نمایاں کامیابی کہیں حاصل نہیں ہوسکی۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں اپنا وقت پورا کرچکی ہیں اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے خواب کی تعبیر کا وقت ابھی نہیں آیا۔ چنانچہ مصر میں 'اخوان المسلمون' کا اندرونِ ملک تقریباً خاتمہ ہوچکا ہے اور اس کے باقیات الصالحات جلاوطنی کے عالم میں دُوَلِ عرب کی باہمی آویزش کے سہارے جی رہے ہیں۔ رہی برِصغیر کی تحریکِ اسلامی تو اس کا جزوِ اعظم پاکستانی سیاست کے نذر ہوچکا ہے اور اب اس کا مقام تحریکِ جمہوریت کی حامی بورژوازی سے زیادہ کچھ نہیں رہا۔[2]

ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بظاہر تو یہ ہے کہ انہوں نے بے صبری سے کام لیا اور اپنے اپنے ملکوں میں سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی معتدبہ تعداد کے ذہنوں کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا جس کے نتیجے میں قومی قیادتوں اور 'ترقی پسند' عناصر سے قبل از وقت تصادم کی نوبت آگئی لیکن درحقیقت ان کی ناکامی براہِ راست نتیجہ ہے ان کے تصورِ دین کی خامی اور مطالعۂ اسلام کے نقص کا۔

---

[1] واضح رہے کہ یہ تحریر آج سے بیس سال قبل کی ہے۔ اب ان تحریکوں کی عمر نصف صدی سے تجاوز ہوچکی ہے۔ [2] یہ بات بھی آج سے دس سال قبل تک تھی گزشتہ دس سالوں کے دوران جماعت نے فوجی آمریت کے ساتھ 'شراکتِ اقتدار' سمجھوتہ کرکے اپنی پوزیشن خراب کرلی ہے!

تعبیر کی کوتاہی!

ذرا دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اسی مغربی نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادّے اور حیاتِ اخروی پر حیاتِ دنیوی کو فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ اسلام کے ان ماوراء الطبیعاتی اعتقادات کا اقرار تو ان کے یہاں موجود ہے جن کے مجموعے کا نام ایمان ہے لیکن انہیں کچھ زیادہ درخورِ اعتناء اور لائقِ التفات نہیں سمجھا گیا اور نگاہیں کلیتہً اس ہدایت و رہنمائی پر مرکوز ہیں جو حیاتِ دنیوی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام نے دی ہیں اور جن کے مجموعے کا نام 'اسلامی نظامِ زندگی' رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار تو موجود ہے لیکن 'ایمان باللہ' کی وہ کیفیت کہ آفاق و انفس میں تنہا وہی فاعلِ مطلق، مؤثرِ حقیقی اور مسبب الاسباب 'نظر' آنے لگے، بالکل مفقود ہے۔ آخرت کا اقرار تو کیا جاتا ہے لیکن اس پر ایسا ایمان کہ "کُنْ فِی الدُّنیا کَاَنَّکَ غَرِیبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیلٍ"[1] کی کیفیت پیدا ہو جائے قطعاً ناپید ہے۔ رسالت کا اقرار تو ہے لیکن محبّتِ رسول ؐ نام کو موجود نہیں اور مقامِ رسالت کا تصوّر زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو ڈاک کے ہرکارے اور صرف اپنی زندگی میں ملّت کے مرکز یعنی رہبر و مطاع سے زیادہ نہیں[2] اور جو سنّت کے مقام سے زیادہ آگاہ ہیں انہوں نے بھی سنّتِ عادت اور سنّتِ رسالت کی تقسیم سے ایسا چور دروازہ پیدا کر لیا ہے جس سے کم از کم اپنی نجی زندگیوں کی حد تک زمانے کا ساتھ دینے کی آزادی برقرار رہے! گویا 'ایمان' کا صرف وہ اقرار پایا جاتا ہے جو قانونی اسلام کی بنیاد ہے اور یہ کیفیت کہ ایمان انسان کا 'حال' بن جائے نہ صرف یہ کہ موجود نہیں ہے بلکہ اس کی کسی ضرورت و اہمیت کا احساس بھی سرے سے عنقا ہے۔!

---

[1] حدیثِ نبوی: —— دنیا میں ایسے رہو جیسے اجنبی یا مسافر!

[2] اس مکتب کی زوردار نمائندگی کا شرف ہمارے یہاں جناب غلام احمد پرویز کو حاصل ہے۔ یہاں اس مکتبِ فکر کے حوالے سے صرف یہ مقصود ہے کہ واضح ہو جائے کہ یہی تعبیر کی اصلاً اسی غلطی کی اگلی منزل ہے!

اسی نقطۂ نظر کا کرشمہ ہے کہ دین اسٹیٹ (STATE) کا ہم معنی قرار پایا ہے اور عبادت اطاعت کے مترادف ہو کر رہ گئی ہے۔ نماز کا یہ مقام کہ وہ معراج المومنین[1] ہے نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے اور نفسِ انسانی کا اس سے ایسا اُنس کہ "قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ"[2] کی کیفیت پیدا ہو سکے ناپید ہے۔ اس کے برعکس زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو صلوٰۃ معاشرے کے ہم معنی قرار پائی ہے اور دوسروں کے نزدیک بھی اس کی اصل اہمیت اس حیثیت سے ہے کہ وہ مسلمان معاشرے کی اصلاح اور تنظیم کا ایک جامع پروگرام ہے! زکوٰۃ کا یہ پہلو کہ یہ روح کی بالیدگی اور تزکیے کا ذریعہ ہے اس قدر معروف نہیں جتنی اس کی یہ حیثیت کہ یہ اسلامی نظامِ معیشت کا اہم ستون ہے۔ روزہ کے بارے میں یہ تو خوب بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ضبطِ نفس (SELF CONTROL) کی مشق و ریاضت ہے لیکن اس کی اس حقیقت کا یا تو سرے سے ادراک ہی نہیں ہے یا اس کے بیان میں 'حجاب' محسوس ہوتا ہے کہ یہ روح کی تقویت کا سامان اور جسدِ حیوانی کی اس پر گرفت کو کمزور کرنے کا ذریعہ ہے چنانچہ یہ حدیث تو تحریر و تقریر میں عام بیان ہوتی ہے کہ "اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ"[3] اور اس کی تشریح پر خوب زور دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ حدیثِ قدسی کہ "الصوم لی وانا اجزی بہ"[4] اوّل تو کم ہی بیان ہوتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو بس سرسری طور پر[5]۔ اسی طرح حج کے بارے میں یہ تو معلوم ہے کہ اس کے ذریعے "خدا پرستی کے محور پر ایک عالمگیر برادری" کی تنظیم ہوتی ہے لیکن اس سے آگے اس کی روحانی برکات کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔!

اسلام کی یہ نئی تعبیر براہِ راست نتیجہ ہے مغرب کے فلسفہ و فکر کے ہمہ گیر تسلط کا جس

---

[1] حدیثِ نبویؐ ــــ "الصلوٰۃ معراج المؤمنین": نماز مومنوں کی معراج ہے! [2] حدیثِ نبویؐ: ــــ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے! [3] حدیثِ نبویؐ: ــــ "روزہ ڈھال کے مانند ہے" [4] حدیثِ قدسی: "روزہ میرے لیے ہے میں خود اس کی جزا دوں گا" یا ایک دوسری قرأت کے مطابق "روزہ میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا ہوں"۔ [5] واقعہ یہ ہے کہ اس حدیثِ قدسی کے صحیح مفہوم تک رسائی ایسے لوگوں کے بس میں ہے ہی نہیں جن کے دل و دماغ پر مادیت کے پردے پڑے ہوتے ہیں!

نے نقطۂ نظر کو ملحدانہ و مادّہ پرستانہ بنا کر رکھ دیا۔ نتیجتہً روح اور اس کی حیاتِ باطنی خارج از بحث ہو گئی۔ اور مادّہ اور حیاتِ دُنیوی ہی سارے غور و فکر کا موضوع اور سوچ بچار کا مرکز بنے۔ چنانچہ دین و مذہب کی بھی مادّی تعبیر ہوئی اور کہنے میں تو اگرچہ یہ آیا کہ اسلام فلاح انسانی کا جامع پروگرام ہے جس میں فلاح اخروی اور فلاح دنیوی دونوں شامل ہیں لیکن نگاہیں چونکہ فی الواقع صرف حیاتِ دنیوی پر مرکوز ہیں لہٰذا آخری تجزیے میں اسلام ایک "سیاسی و عمرانی نظام" — (POLITICO -SOCIAL SYSTEM) بن کر رہ گیا — اور "الٰہیات" کی حیثیت ایک "پردے" سے زیادہ نہ رہی[1]! چنانچہ زندگی کا اصل مقصد یہ قرار پایا کہ اس نظامِ زندگی کو عملاً رائج و نافذ کیا جائے۔ رہی خدا کی معرفت و محبت اور اس کے سامنے تضرّع و اِخبات جو 'عبادت' کا اصل جوہر ہیں تو ان کی حیثیت بالکل ثانوی و اضافی ہو کر رہ گئی[2]۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں فی الواقع 'مذہبی' سے زیادہ 'سیاسی و عمرانی' اور 'دینی' سے زیادہ 'دنیوی' ہیں۔ اور آخری تجزیے میں دوسری سیاسی و معاشی تحریکوں سے صرف اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ اُن کے نزدیک سرمایہ دارانہ جمہوریت یا

---

[1] چنانچہ اس دَور کے ایک بہت بڑے متکلم اور داعیٔ اسلام کا یہ فقرہ ایک تقریر میں راوی نے روایت کیا کہ "اسلام دراصل ایک سیاسی و عمرانی نظام ہے جس پر الٰہیات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے"۔ ع "چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است!"

[2] یہ صورت حال بھی خاصی قدامت پسند اسلامی تحریکوں کے یہاں ہے — ورنہ زیادہ ترقی پسند لوگوں نے تو فکرِ مغرب کی منطقی انتہا یعنی سوشلزم اور کمیونزم کے زیرِ اثر اسلام کو سیاسی و عمرانی سے بھی آگے بڑھ کر محض ایک معاشی پروگرام بنا کر رکھ دیا ہے یعنی ان کے نزدیک اسلام عبارت ہے محض ایک مخصوص نظامِ ربوبیت سے باقی رہے اعتقادات و ایمانیات تو اُن کے ضمن میں جہاں سرسیّد مرحوم کی انتہا ہوئی تھی وہاں سے انہوں نے ابتدا کی اور جنت و دوزخ کی تعبیر اسی دنیا کے عیش و آرام اور کلفت و مشقت سے اور قیامت کی تعبیر ایٹمی دھماکوں سے کر کے سارا معاملہ ہی ختم کر دیا۔ تاہم باوجود اس کے کہ ہماری نگاہ میں یہ بھی اسلام کی مادّی تعبیر ہی کی 'منطقی انتہا' ہے، مذہب کی یہ تعبیر ہمارا موضوعِ بحث نہیں اس لیے کہ چاہے اسے "قرآنی فکر" ہی کا نام کیوں نہ دیا گیا ہو اس کا خالص مادّی اور خلافِ قرآن ہونا اظہر من الشمس ہے اور ہم نے اس 'فکر' کی جانب کچھ اشارے کیے بھی ہیں تو محض ضمنی طور پر تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ دین و مذہب کی مادّی تعبیر کا سلسلہ بالآخر یہاں تک جاتا ہے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج تا ثریا مے رود دیوار کج !!!

اشتراکیت بہتر نظام ہائے حیات ہیں اور اِن کے نزدیک اسلام انسانی زندگی کے جملہ مسائل کو بہتر طور پر حل کرتا ہے ——— گویا درحقیقت مذہب کی اصل اقدار کے احیاء کا کام تو ابھی شروع بھی نہیں ہوا ؎

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی کہ رُوحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

یہی سبب ہے کہ یہ تحریکیں بے لنگر کے جہازوں کے مانند اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہیں اور ان کا حال اکثر و بیشتر اُس مسافر کا سا ہے جسے نہ تو منزل ہی کا پتہ رہا اور نہ یہ ہی یاد رہا کہ سفر شروع کہاں سے کیا تھا ؎

ہم تو فانی جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

'احیائے اسلام' کی شرطِ لازم
'تجدیدِ ایمان'

اسلام کی بنیاد ایمان پر ہے اور احیائے اسلام کا خواب ایمان کی عمومی تجدید کے بغیر کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا! مسلمان ممالک کی سیاسی آزادی و خود اختیاری بھی یقیناً بہت اہم ہے اور اس سے بھی ایک حد تک اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی راہ ہموار ہوئی ہے اسی طرح اسلامی نظام زندگی کا تصوّر اور اس پر ایک بہتر نظامِ حیات ہونے کے اعتبار سے اعتماد بھی ایک حد تک مفید اور قابلِ قدر ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ پیدا ہوا یا ہو رہا ہے ان کی سعی و جہد بھی احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے لیکن اصل اور اہم تر کام ابھی باقی ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمِ اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگ اس امر کی جانب متوجہ ہوں اور جنہیں اس کی اہمیت کا احساس ہو جائے وہ اپنی تمام تر سعی و جہد کو اس پر مرکوز کر دیں کہ امت میں تجدید ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو اور ایمان نرے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر 'حال' کی صورت اختیار کرے!

ایمان لامحالہ کچھ ماوراء الطبعیاتی حقائق پر یقین کا نام ہے۔ اور اس راہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان اُن دیکھی، حقیقتوں پر دکھائی دینے والی چیزوں سے زیادہ یقین رکھے اور سر کے کانوں سے سُنی جانے والی باتوں سے کہیں زیادہ اعتماد اُن باتوں پر کرے جو صرف دل کے کانوں سے سُنی جاسکتی ہیں۔ گویا "ایمان بالغیب" اس راہ کی شرطِ اوّلین ہے اور اس کے لیے فکر و نظر کا یہ انقلاب اور نقطہ نظر اور طرزِ فکر کی یہ تبدیلی لازمی و لابدی ہے کہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی و خیالی نظر آئے لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہو۔ کائنات کا پورا سلسلہ نہ از خود قائم معلوم ہو نہ کچھ لگے بندھے قوانین کے تابع چلتا نظر آئے بلکہ ہر آن و ہر سمت ارادۂ خداوندی و مشیتِ ایزدی کی کارفرمائی محسوس و مشہود ہو جائے۔ مادّہ حقیر و بے وقعت نظر آئے لیکن روح ایک حقیقتِ کبریٰ معلوم ہو۔ انسان کا اطلاق اس کے جسدِ حیوانی پر نہ ہو بلکہ اس رُوحِ ربانی پر کیا جائے جس کی بدولت وہ مسجودِ ملائک ہوا[1] ——— حیاتِ دنیوی فانی و ناپائیدار ہی نہیں بالکل غیر حقیقی و بے وقعت معلوم ہو اور حیاتِ اخروی ابدی و سرمدی اور حقیقی و واقعی نظر آنے لگے!! اور اللہ تعالےٰ کی رضا اور خوشنودی کے مقابلے میں دنیا و مافیہا کی وقعت حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق مچھر کے پَر سے زیادہ محسوس نہ ہو! یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ جب تک اُمّت کے ایک قابلِ ذکر اور مؤثر حصے میں نقطہ نظر کی یہ تبدیلی واقعۃً پیدا نہ ہو جائے "احیائے اسلام" کی آرزو ہرگز شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے گی۔

عوام کی کشتِ قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا مؤثر ترین ذریعہ ایسے اصحابِ علم و عمل کی صحبت ہے جن کے قلوب و اذہان معرفتِ ربانی و نورِ ایمانی سے منوّر، سینے کبر، حسد، بُغض اور ریا سے پاک اور زندگیاں حرص، طمع، لالچ اور حُبِّ دنیا سے خالی نظر آئیں۔ خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد ایسے ہی نفوسِ قدسیہ

---

[1] آیہ قرآنی: "فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ" ———
ترجمہ: جب میں اسے پوری طرح بنا چکوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو گر جانا اس کے لیے سجدے میں۔

کی تبلیغ و تعلیم، تلقین و نصیحت اور تربیت و صحبت کے ذریعے ایمان کی روشنی پھیلتی رہی ہے۔ اور اگرچہ جب سے مغرب کی الحاد و مادہ پرستی کے زہر سے مسموم ہواؤں کا زور ہوا ایمان و یقین کے یہ بازار بھی بہت حد تک سرد پڑ گئے تاہم ابھی ایسی شخصیتیں بالکل ناپید نہیں ہوئیں جن کے "دلِ روشن" "نورِ یقین" اور "نفسِ گرم" حرارتِ ایمانی سے معمور ہیں۔ اور اب ضرورت اس کی ہے کہ ایمان و یقین کی ایک عام رَو ایسی چلے کہ قریہ قریہ اور بستی بستی ایسے صاحب عزیمت لوگ موجود ہوں جن کی زندگیوں کا مقصدِ وحید خدا کی رضاجوئی اور اس کی خوشنودی کا حصول ہو اور جن کی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک کے مطابق کہ لَاَنْ یَّھْدِیَ بِکَ اللّٰہُ رَجُلًا وَّاحِدًا خَیْرٌ لَّکَ مِنْ حُمُرِ النَّعَمِ[1] خلق کی ہدایت و رہنمائی کو زندگی کا واحد لائحہ عمل قرار دے لیں۔ اور اس کے سوا ان کی زندگی میں کوئی اور تمنا، آرزو یا حوصلہ و اُمنگ باقی نہ رہے۔

خوش قسمتی سے برصغیر ہند و پاک میں ایک وسیع پیمانے پر ایسی حرکت پیدا بھی ہو چکی ہے جس کے زیر اثر عوام میں ایمان کی روشنی پھیل رہی ہے اور کائنات سے زیادہ خالق کائنات مادے سے زیادہ رُوح اور حیاتِ دنیوی سے زیادہ حیاتِ اُخروی کی اہمیت کا احساس اجاگر ہو رہا ہے۔ ہماری مراد جماعتِ تبلیغی سے ہے جسے بجا طور پر تحریکِ دیوبند کی ایک شاخ قرار دیا جا سکتا ہے اور جس کی تاسیس کچھ ایسے اصحابِ ایمان و یقین کے ہاتھوں ہوئی ہے کہ آج ایک تہائی صدی[2] سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود اس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی، اور اس کے باوجود کہ اس کے طریقِ کار سے ہم کلیتہً اتفاق نہیں کرتے ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس کے زیر اثر لوگوں کے طرزِ فکر اور نقطۂ نظر میں ایک ایسی عمومی تبدیلی واقعتہً پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اصل حیثیت کائنات کی نہیں خالق کائنات کی ہے اور اصل اہمیت اسباب کی نہیں مسبب الاسباب کی ہے۔ بھوک غذا سے

---

[1] حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے کسی ایک انسان کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ بہتر ہے"۔

[2] اب اس تحریک کی عمر بھی نصف صدی سے تجاوز کر چکی ہے۔!

نہیں حکم خداوندی سے مٹتی ہے اور پیاس پانی سے نہیں اذنِ باری تعالیٰ سے بجھتی ہے! دین کے چھوٹے سے چھوٹے احکام انہیں کسی منطقی استدلال کی بنا پر یا کسی نظامِ زندگی کے اجزا یا اس کو قائم کرنے کے ذرائع کی حیثیت سے نہیں بلکہ فی نفسہٖ خیر نظر آنے لگتے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوٹی سے چھوٹی سنتیں بجائے خود نورانی معلوم ہونے لگتی ہیں اور زندگی اور اس کے لوازمات کے باب میں کم از کم پر قناعت کر کے وہ اپنے اوقات کا معتدبہ حصّہ ایک مخصوص طریق پر تبلیغ و اشاعتِ دین کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔

لیکن چونکہ اس تحریک میں اصل تخاطب عقل سے نہیں جذبات سے ہے اور اس کی اصل اساس علم پر نہیں عمل پر ہے لہٰذا اس کے اثرات محدود ہیں اور معاشرے کے وہ طبقے جن کے یہاں جذبات پر عقل اور عمل پر علم کو اوّلیت حاصل ہے اس سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ اپنی ذہنی ساخت کی بنا پر مجبور ہوتے ہیں کہ عقل کی جملہ وادیاں طے کر کے عشق کی وادی میں قدم رکھیں اور خرد کی تمام گتھیاں سلجھانے کے بعد صاحبِ جنون ہوں۔ پھر یہ بھی ایک مسلّم حقیقت ہے کہ ایسی قسم کے لوگ ہر دور اور ہر معاشرے کی وہ ذہینی اقلیت (INTELLECTUAL MINORITY) ہوتے ہیں جو از خود معاشرے کی رہنمائی کے منصب پر فائز اور اجتماعیت کی پوری باگ ڈور پر قابض ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبدیلی اور ان کے فکر و نظر کے انقلاب کو اوّلین اہمیت حاصل ہے ——— اور اگر خدانخواستہ ایمان ان لوگوں کے دلوں میں جاگزیں نہ ہو سکا اور انہیں جہالت و جاہلیت کی ظلمتوں سے نکالا نہ جا سکا تو صرف عوام الناس کے قلوب و اذہان کی تبدیلی سے کسی مؤثر اور پائیدار تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

کرنے کا اصل کام

بنا بریں وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک ایسی اُٹھے

جو سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات یعنی معاشرے کے ذہین ترین عناصر کے فکر و نظر میں انقلاب برپا کر دے ——— اور انہیں مادیت و الحاد کے اندھیروں سے نکال کر ایمان و یقین کی روشنی میں لے آئے اور خدا پرستی و خود شناسی کی دولت سے مالا مال کر دے۔ خالص علمی سطح پر اسلامی اعتقادات کے مدلل اثبات اور الحاد و مادہ پرستی کے پُر زور ابطال کے بغیر اس مہم کا سر ہونا محال ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ چونکہ موجودہ دور میں فاصلے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور پوری نوع انسانی ایک کنبے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے لہٰذا علمی سطح کا تعین کسی ایک ملک کے اعتبار سے نہیں بلکہ پوری دنیا کے اعلیٰ ترین معیار کے مطابق کرنا ہوگا ——— اور اگرچہ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ کام انتہائی کٹھن اور سخت محنت طلب ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس کے بغیر اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے خواب دیکھنا جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے۔

پیش نظر علمی تحریک کے لیے سب سے پہلے ایسے ذہین اور باصلاحیت نوجوانوں کو تلاش کرنا ہوگا جن میں علم کی ایک شدید پیاس فطری طور پر موجود ہو، جن کے قلوب مضطرب اور روحیں بے چین ہوں، جن کو خود اپنے اندر یہ احساس موجود نظر آئے کہ اصل حقیقت حواس کی سرحدوں سے بہت پرے واقع ہے اور جن میں حقیقت کی تلاش و دریافت کا داعیہ اتنا شدید ہو جائے کہ وہ اس کے لیے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں اور آرام و آسائش کے حصول اور خوشنما مستقبل (CAREERS) کی تعمیر سے یکسر بے نیاز ہو جائیں۔

ایسے نوجوانوں کو اولاً انسان کی آج تک کی سوچ بچار کا مکمل جائزہ لینا ہوگا، اور اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ انسانی فکر کی پوری تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں۔ اس اعتبار سے منطق، ماوراء الطبیعات، نفسیات، اخلاقیات اور روحانیات ان کے مطالعہ اور غور و فکر کا اصل میدان ہوں گے۔ (اگرچہ ضمنی طور پر عمرانیات اور طبعیات کی ضروری معلومات کی تحصیل بھی ناگزیر ہوگی) فکر انسانی کے اس گہرے اور تحقیقی مطالعے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ

وحیِ آسمانی اور اس کے آخری جامع اور مکمل ایڈیشن یعنی قرآن حکیم کا گہرا مطالعہ حقیقت کی تلاش اور حقیقتِ نفس الامری کی دریافت کے نقطۂ نگاہ سے کریں۔

پھر اگر ایسا ہو کہ قرآن کی روشنی ان پر واضح ہو جائے، اس کا پیغام
انہیں اپنی فطرت کی آواز معلوم ہو، اس کے نور سے ان کے قلوب و
اذہان منوّر ہو جائیں، آفاق و انفس کی حقیقت و ماہیت کے بارے
میں تمام بنیادی سوالوں کا تشفی بخش جواب انہیں مل جائے اور
انبساطِ معرفت سے ان کے نفوس میں امن اور سکون و اطمینان
کی کیفیت پیدا ہو جائے، تو اسی کا نام ایمان ہے۔!

پھر یہی ہوں گے جنہیں "رسوخ فی العلم" حاصل ہوگا۔ جن کا علم ذہنی و اخلاقی آوارگی کے بجائے تقویٰ و خشیتِ الٰہی پر منتج ہوگا جن کی شخصیتیں "اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ"[1] کی مجسم تفسیر اور "ع" قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن" کی عملی تصویر ہوں گے اس لیے کہ قرآن کا "مغز" دراصل یہی 'علمِ حقیقت' ہے جس کا دوسرا نام ایمان ہے۔ قانون و شریعت کی اہمیت بجائے خود اگرچہ نہایت عظیم ہے لیکن اس کے مقابلے میں ان کی حیثیت واقعۃً "استخوان" کی ہے[2]! —— اور حقیقت یہ ہے کہ اس کیفیتِ ایمانی کی تحصیل کے بغیر قرآن کے بیان کردہ قانون و شریعت پر غور و فکر بالکل بے کار ہے۔ یہی رمز ہے جو حضرت ابن عباسؓ کے اس قول میں بیان ہوا کہ تَعَلَّمْنَا الْاِیْمَانَ ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرْاٰنَ[3]

مغرب کے فلسفہ و فکر کے مؤثر ابطال اور اس کی تہذیب و تمدن کے واقعی استیصال کا کٹھن کام صرف ان لوگوں کے بس کا ہے جو 'علمِ حقیقت' کے ان چشموں سے اچھی طرح سیراب

---

[1] آیت قرآنی: "اللہ کی خشیت اس کے اہلِ علم بندوں ہی کے دلوں میں گھر کرتی ہے۔"!
[2] ما ز قرآں مغز را برداشتیم ۔ استخواں پیشِ سگاں انداختیم (رومی)
[3] ترجمہ: "ہم نے پہلے ایمان سیکھا اور پھر قرآن۔"

ہوں جو قرآن حکیم کی آیاتِ بیّنات کی صورت میں رواں ہیں، ان ہی کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ آج کے فلاسفہ کے لیے ایک نئی "تہافت"[1] تصنیف کرسکیں اور آج کے منطقیین پر از سرِ نو "رد" کر[2] سکیں، اور فی الجملہ الحاد و مادہ پرستی کے اس سیلاب کا رُخ پھیر دیں جو تقریباً دو صدیوں سے ذہنِ انسانی کو بہائے لیے چلا جارہا ہے۔

اس تخریب کے ساتھ انہیں جدید علم الکلام کی تاسیس کا 'مثبت' کام بھی کرنا ہوگا تاکہ ریاضی، طبعیات، فلکیات، حیاتیات اور نفسیات کے میدان میں جن حقائق کی دریافت آج تک ہوئی ہے[3] اور جو اسی حقیقتِ کلّی کی ادنیٰ جزئیات ہیں جن کا مظہرِ اتم ایمان ہے، انہیں اسلامی عقائد کے نظام میں اپنے اپنے مقام پر صحیح طور سے فِٹ کیا جاسکے۔ آج سے پینتیس چالیس سال قبل علّامہ اقبال مرحوم نے "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید" کے سلسلے میں جو کام کیا تھا اس کا وہ حصّہ تو اگرچہ بہت محلِّ نظر ہے جو شریعت و قانون اور اجماع و اجتہاد سے بحث کرتا ہے (اور جو فی الواقع "الٰہیات" سے براہ راست متعلق بھی نہیں ہے) تاہم اپنے اصل موضوع کے اعتبار سے علّامہ مرحوم کی یہ کوشش بڑی فکر انگیز تھی اور جیسا کہ خود علّامہ نے کتاب کے دیباچے میں فرمایا تھا کہ ——— "ہوسکتا ہے کہ جیسے جیسے علم آگے بڑھے اور فکر کی نئی راہیں کھلیں، زیرِ نظر کتاب میں جو خیالات بیان ہوئے ہیں، ان کے علاوہ بلکہ ان سے صحیح تر خیالات ظاہر ہوں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسانی فکر کے ارتقاء کا ایک آزاد تنقیدی نقطۂ نگاہ سے مسلسل جائزہ لیتے رہیں ۔ ۔ ۔ ۔" اگر انہی خطوط پر کام جاری رہتا اور کچھ باہمت لوگ اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے تو ایک بہت وقیع و قابلِ قدر کام ہوجاتا لیکن افسوس کہ خود علّامہ مرحوم کے حلقۂ اثر میں سے بھی کسی نے اس میدان کو اپنی جولانیِ طبع کے لیے منتخب نہیں کیا۔!

---

[1] تہافت الفلاسفہ۔ تالیف امام غزالیؒ۔

[2] الرّد علی المنطقیین۔ تالیف امام ابن تیمیہؒ

[3] واضح رہے کہ اس ضمن میں "حقائق" اور "نظریات" کے مابین فرق و امتیاز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

بہرحال جب تک اس میدان میں واقعی قدر و قیمت رکھنے والا کام ایک قابلِ ذکر حد تک نہیں ہو جاتا یہ اُمید کہ معاشرے کے ذہین طبقات کو مذہب کی طرف راغب کیا جا سکے گا محض سراب کا درجہ رکھتی ہے ——!

"الٰہیات اسلامیہ کی تشکیلِ جدید" کے بعد دوسرا اہم کام یہ ہے کہ حیاتِ دُنیوی کے مختلف پہلوؤں یعنی سیاست و قانون اور معاشرت و معیشت کے باب میں اسلام کی ہدایت و رہنمائی کو مدلل و مفصّل واضح کیا جائے۔ اس ضمن میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے پچھلے پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں خاصا کام مصر اور برِصغیر ہند و پاک میں ہوا ہے خصوصاً جماعتِ اسلامی اور الاخوان المسلمون نے "اسلامی نظامِ حیات" اور "عدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام" کو تصنیف و تالیف کا مرکزی موضوع بنایا ہے تاہم اس سارے کام کو بس ایک اچھی ابتدا قرار دیا جا سکتا ہے اور اِدھر کچھ عرصہ سے مکھی پر مکھی مار دینے اور تقریباً ایک سی سطح اور ایک سے معیار کی تالیفات مختلف ناموں سے شائع کر دینے کا جو سلسلہ چل نکلا ہے اس نے بہت حد تک اس اساسی کام کی اہمیت بھی ختم کر دی ہے جو بجائے خود خاصا قابلِ قدر تھا۔ اس ضمن میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ نیم خواندہ یا بقول مولانا اصلاحی "پڑھے کم لکھے زیادہ" لوگوں کی تصنیفات و تالیفات کی ایک خاص تکنیک کے ذریعے ایک مخصوص حلقے میں فروخت سے بعض لوگوں کا معاشی مسئلہ تو ضرور حل ہو سکتا ہے دین کی کوئی مثبت اور پائیدار خدمت ممکن نہیں ہے آج کی دنیا میں خصوصاً اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں رکھنے والے لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ مسلّمہ علمی قابلیت رکھنے والے لوگوں کے سوا کسی مؤلف و مصنف کی جانب التفات کر سکیں۔ لہٰذا لازم ہے کہ جو کام بھی کیا جائے وہ معیاری ہو اور کمیت سے زیادہ کیفیت پیشِ نظر رہے۔

اس کام کے لیے بھی ظاہر ہے کہ ایک طرف موجودہ دنیا کے مسائل و معاملات کا صحیح فہم اور عمرانیات کے مختلف میدانوں میں جدید رجحانات کا براہِ راست علم ضروری ہے

اور دوسری طرف قرآن و سنّت میں گہری مہارت لازمی ہے اور جب تک یہ صورت نہ ہو کہ ان دونوں اطراف کا مطالعہ یکساں دِقّتِ نظر کے ساتھ کیا جائے معیاری نتائج کی توقع عبث ہے۔

عملی اقدامات

متذکرہ بالا علمی تحریک کے اجراء کے لیے فوری طور پر دو چیزیں لازمی ہیں۔

ایک یہ کہ عمومی دعوت و تبلیغ کا ایک ایسا ادارہ قائم ہو جو ایک طرف تو عوام کو تجدیدِ ایمان اور اصلاحِ اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجہ ہوں ان کی ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی تربیت کا بندوبست کرے[1] اور ساتھ ہی اس علمی کام کی اہمیت ان لوگوں پر واضح کرے جو خلوص اور دردمندی کے ساتھ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے آرزومند ہیں اور دوسری طرف ایسے ذہین نوجوان تلاش کرے جو پیشِ نظر علمی کام کے لیے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں۔ آج کے دور میں، جبکہ مادیت اور دنیا پرستی کا قلوب و اذہان پر مکمل تسلط ہے اور کچھ توفی الواقع طلبِ معاش کا سلسلہ اتنا کٹھن ہو گیا ہے کہ اکثر لوگوں کو اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں اسی کے حل پر مرکوز کر دینی پڑتی ہیں، پھر معاشرے کا عام رجحان یہ ہو گیا ہے کہ جو ذرا اس سطح سے بلند ہوتا ہے اس پر معیارِ زندگی کو بلند تر کرنے کی دھن سوار ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے نوجوانوں کا ملنا بظاہر محال نظر آتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا سعید روحوں سے کبھی خالی نہیں ہوئی اور اگر کچھ مخلص و صاحبِ عزیمت لوگ ذہنی یکسوئی کے ساتھ اس کام کا بیڑا اٹھالیں تو انشاء اللہ اسی معاشرے میں بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک نوجوان ایسے مل جائیں گے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک کو کہ خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ[2] اپنا لائحہ عمل بنا کر علمِ قرآن کی تحصیل و اشاعت کے لیے زندگی وقف کر دیں — یہ بھی واضح رہے کہ اصل ضرورت صرف اس کی ہوتی ہے کہ کسی جذبہ و خیال کے تحت انسان

---

[1] الحمدللہ کہ ان مقاصد کے لیے ۱۹۷۵ء میں "تنظیمِ اسلامی" کا قیام عمل میں آگیا
[2] حدیث نبویؐ: — "تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں"۔

میں داخلی طور پر ایک داعیہ بیدار ہو جائے، پھر یہ داعیہ کام کی راہیں خود پیدا کر لیتا ہے اور تمام موانع و مشکلات سے خود نبٹ لیتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ اس خیال کو عام اور اس کی ضرورت کے احساس کو اُجاگر کیا جائے پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس اعلیٰ و ارفع نصب العین کے لیے کام کرنے والے دستیاب نہ ہو سکیں۔

دوسرے یہ کہ ایک قرآن اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جائے ——— جو ایک طرف علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا بندوبست کرے تاکہ قرآن کا نور عام ہو اور اس کی عظمت لوگوں پر آشکارا ہو اور دوسری طرف ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے جو بیک وقت علوم جدیدہ سے بھی بہرہ ور ہوں اور قرآن کے علم و حکمت سے بھی براہِ راست آگاہ ہوں تاکہ متذکرہ بالا علمی کاموں کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔

علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا اہم ترین نتیجہ یہ نکلے گا کہ عام لوگوں کی توجہات قرآن حکیم کی طرف مرکوز ہوں گی، ذہنوں پر اس کی عظمت کا نقش قائم ہوگا، دلوں میں اس کی محبت جاگزیں ہوگی اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہوگا۔ نتیجۃً بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے 'متعارف' ہوں گے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے ایک اچھی بھلی تعداد ایسے نوجوانوں کی نہ نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی کو اس کے علم و حکمت کی تحصیل اور نشر و اشاعت کے لیے وقف کر دیں۔ ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس اکیڈمی کا اصل کام ہوگا، اور اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ان کو پختہ بنیادوں پر عربی کی تعلیم دی جائے یہاں تک کہ ان میں زبان کا گہرا فہم اور اس کے ادب کا ستھرا ذوق پیدا ہو جائے۔ پھر انہیں پورا قرآن حکیم سبقاً سبقاً پڑھایا جائے، اور ساتھ ہی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، فقہ اور اصولِ فقہ کی تعلیم دی جائے ——— پھر ان میں سے جو لوگ فلسفہ الٰہیات کا ذوق رکھنے والے ہوں گے، ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ قرآن حکیم کی روشنی میں جدید فلسفیانہ رجحانات پر مدلل تنقید کریں اور جدید علم الکلام کی بنیاد رکھیں۔ اور جو عمرانیات کے مختلف

شعبوں کا ذوق رکھنے والے ہوں گے ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام کی رہنمائی و ہدایت کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کر سکیں۔

پس نوشت

صفحاتِ گزشتہ میں "قرآن اکیڈمی" کا جو خاکہ سامنے آیا وہ راقم کے قلم سے جون ۱۹۶۷ء میں نکلا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بالکل اسی نظریے اور خیال کے تحت اوّلاً ۱۹۱۴ء میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے "دارالارشاد" قائم کیا تھا۔ اور پھر ۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال مرحوم کی تحریک پر "دارالاسلام" کی تاسیس ہوئی تھی۔

"دارالارشاد" کے بارے میں مولانا آزاد نے ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کے 'البلاغ' میں جو شذرہ لکھا تھا اور "دارالاسلام" کے ضمن میں علامہ اقبال نے جو خط شیخ الازہر علامہ مصطفیٰ المراغی کو تحریر کیا تھا۔ ان کے اقتباسات اس صفحہ کی پشت پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ جن سے اس حیرت انگیز مماثلت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے جو ان تینوں تجویزوں کے مابین پائی جاتی ہے۔ لیکن افسوس کہ پیش نظر مقاصد کے لیے کوئی عملی پیش قدمی نہ "دارالارشاد" کے ذریعے ہو سکی نہ "دارالاسلام" کے۔ ان میں سے مقدم الذکر کے بارے میں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کتنے عرصے قائم رہا اور کب ختم ہوا، اور اغلباً اس کے لیے کہیں کوئی اینٹ رکھنے کی نوبت بھی نہیں آئی، البتہ "دارالاسلام" کے نام سے ایک ادارہ باقاعدہ قائم ہوا۔ اس کے لیے ایک ٹرسٹ وجود میں آیا اور کچھ عمارات بھی ضلع گورداسپور میں پٹھانکوٹ کے قریب سرنار ریلوے سٹیشن سے متصل منصۂ شہود پر آ گئیں۔ جہاں اگست ۱۹۴۱ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک غیر منقسم ہندوستان کی جماعتِ اسلامی کا مرکزی دفتر قائم رہا اور اس اعتبار سے یقیناً وہ عمارات ایک اعلیٰ مصرف میں آئیں لیکن ان مقاصد کے لیے براہِ راست کوئی پیش قدمی وہاں بھی نہ ہو سکی، جن کے لیے وہ ادارہ اصلاً قائم ہوا تھا۔

"دارالارشاد کا مقصد"

"چند سال پیشتر کا واقعہ ہے کہ مشیتِ الٰہی نے اس عاجز کی رہنمائی کی ذرا الہلال نے قرآن حکیم کی تبلیغ و دعوت کی صدا از سرِ نو بلند کی۔ لیکن اس عرصہ میں جو کچھ ہوا وہ ایک دعوتِ عام تھی، جس کے ذریعے فہم و بصیرتِ قرآن کی نئی راہیں عوام و خواص نے اپنے سامنے دیکھیں اور قرآن کریم کی عشق و شیفتگی کا ایک نیا ولولہ دلوں میں پیدا ہو گیا۔ تاہم اس دعوت کی ایک دوسری منزل ابھی باقی ہے اور وہی فی الحقیقت اہم تر مقامِ سعی و تعب ہے یعنی قوم میں بکثرت ایسے افراد پیدا کیے جائیں جو انہی راہوں پر چل کر قرآن حکیم کے علوم و معارف کو تکمیل حاصل کریں اور ان کے ذریعے قوم میں ارشاد و ہدایت اور احیائے دعوت و ذکر کا عملی سلسلہ بالعموم شروع ہو سکے۔

'دارالارشاد' کا مقصد یہی ہے کہ دعوت الی القرآن کی اس دوسری منزل کا سر و سامان ہو اور تھوڑے وقت اور بہت زیادہ صرف علم و فکر سے ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جو قرآن حکیم کی دعوت و تبلیغ کی خدمت اور اصلاح و ارشادِ اُمت کا فرض انجام دے سکے۔"

(البلاغ : ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء)

"دارالاسلام" کا مقصد

"ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علوم جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور علوم دینیہ کے چند ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیتیں ہوں اور ان کی رہنمائی کے لیے ہم ایک ایسا معلّم جو کامل اور صالح ہو اور قرآن حکیم میں مہارتِ تامہ رکھتا ہو نیز انقلابِ دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو، مقرر کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی رُوح سے واقف کرے اور تفکرِ اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ، حکمت، اخلاق، سیاسیات اور اقتصادیات کے علوم میں ان کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے تمدنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے کے لیے جہاد کر سکیں!"

(بحوالہ "اقبال" "دارالاسلام اور مودودی" صفحہ ۸۲)

باب دوم

فکرِ مغرب کی اساس

اور اس کا تاریخی پس منظر

از

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

مرحوم

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کا مندرجہ ذیل مضمون بظاہر تو ایک خط ہے جو موصوف نے راقم الحروف کے اس مضمون کی تحسین اور تائید کے لیے لکھا تھا جو جون ۱۹۶۷ء کے میثاق میں تذکرہ و تبصرہ کے عنوان کے تحت شائع ہوا تھا لیکن اس نے یورپ کے فلسفہ و فکر کے تاریخی ارتقاء کے موضوع پر ایک جامع اور مبسوط مقالے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انتہائی اختصار اور کمال جامعیت کے امتزاج کے اعتبار سے یہ تحریر اپنی مثال آپ ہے۔ کاش کہ پروفیسر صاحب کی بعض دوسری ناگزیر مصروفیات نے موصوف کو مہلت دی ہوتی اور وہ اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے لکھ سکتے تو فلسفۂ جدید کے طالب علموں کی رہنمائی کا ایک مستقل سامان ہو جاتا۔ بحالتِ موجودہ بھی یہ یقین ہے کہ یہ تحریر فلسفۂ جدید کے بہت سے طالب علموں کے لیے انتہائی مفید ثابت ہوگی۔

پروفیسر صاحب کی یہ تحریر بھی اولاً 'میثاق' کی دسمبر ۶۷ء اور جنوری ۶۸ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں جب وہ مقالہ 'دارالاشاعت الاسلامیہ' کے تحت "اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" کے عنوان سے شائع ہوا تو پروفیسر صاحب کی اس تحریر کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم و مغفور نے 'صدقِ جدید' کی اشاعت بابت ۷ رفروری ۱۹۶۹ء میں تحریر فرمایا تھا۔

"دونوں مقالے ماہنامہ 'میثاق' لاہور میں قسط وار نکل چکے ہیں۔ دونوں کا موضوع نام سے ظاہر ہے، دونوں فکر انگیز ہیں۔ اور ایک طرف جوش و اخلاص اور دوسری طرف دانش و باریک بینی کے مظہر ہیں۔ مرض کی تشخیص اور تدبیر علاج دونوں میں دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ رسالہ ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے۔"

خاکسار

اسرار احمد

برادرم عزیزم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میثاق ماہ جون ۱۹۶۷ء میں جو خیالات آپ نے تحتِ "تذکرہ وتبصرہ" سپردِ قلم کیے ہیں ان کو پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور آپ کے لیے تہِ دل سے دُعا بھی نکلی۔ آپ نے عصرِ حاضر پر جو تبصرہ کیا ہے وہ صحیح ہے۔ اہلِ مغرب کا ملحدانہ زاویۂ نگاہ، اس زاویۂ نگاہ کا اہلِ مشرق کے ذہنوں پر تسلّط، اس کے مُضر نتائج، اس ناگوار صورتِ حال سے رہائی کی تجویز اور اصلاحِ حال کی راہ۔ اِن مباحث پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ بلاشبہ آپ کی اصابتِ فکر و رائے، معاملہ فہمی، ژرف نگاہی اور حقائق رسی کا واضح ثبوت ہے۔ مَیں آپ کو صدقِ دل سے مبارکباد دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جوانی میں بوڑھوں کی سی سمجھ عطا فرمائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کی دینی اصلاح کی کسی خدمت کے لیے آپ کو منتخب کر لیا ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو خدمتِ دین کی بیش از بیش توفیق بھی عطا فرمائے۔

مَیں نے بھی نصف صدی تک (از ۱۹۱۷ء تا ایندم) انہی دو تین مسائل پر غور کیا ہے۔ یعنی مغرب میں الحاد اور مادّیت کے فروغ کے اسباب، ان مغربی افکار کا اقوامِ مشرق کے ذہنوں پر تسلّط اور اس تسلّط سے رہائی کی صورت۔ مجھے آپ کا مضمون پڑھ کر جو غیر معمولی مسرت حاصل ہوئی ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میرے نتائجِ افکار اور آپ کے نتائجِ افکار میں حیرت انگیز مطابقت پائی جاتی ہے۔ میری رائے میں آپ کی خدمت میں ہدیۂ تحسین پیش کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ مَیں آپ کے بعض دعاوی کو مبرہن اور مدلّل کر دوں، بعض حقائق کی وضاحت کر دوں، بعض صداقتوں کو مؤکّد کر دوں اور بعض تجاویز کو مؤید کر دوں۔

۱۔ آپ نے لکھا ہے:

"موجودہ دَور بجا طور پر مغربی فلسفہ و فکر اور علوم و فنون کی بالادستی کا دَور ہے اور آج پورے کرۂ ارض پر مغربی افکار و نظریات اور انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصوّرات پوری طرح چھاتے ہوتے ہیں جن کی ابتدا۔

آج سے دو سو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی"۔ نیز یہ کہ "مغربی تہذیب و تمدّن اور فلسفہ و فکر کا یہ تسلّط بہت شدید اور ہمہ گیر ہے"۔

آپ کا یہ تبصرہ بالکل صحیح ہے چنانچہ میرے اور علامہ اقبالؒ دونوں کے معنوی مرشد لسان العصر اکبر الٰہ آبادی نے آج سے پچاس سال پہلے انہی حقائق کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں یوں بیان کر دیا تھا:۔

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردّی
بدھوا کر رہے ہیں "صاحب نے یہ کہا ہے"

اور:۔

چیز وہ ہے بتے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پائیر میں چھپے

۲:۔ آپ نے لکھا ہے:۔

"لیکن اس پورے ذہنی اور فکری سفر کے دوران ایک نقطۂ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پر اس پورے فکر کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں خیالی اور ماورائی تصوّرات کے بجائے ٹھوس حقائق کو غور و فکر کا اصل مرکز ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور خدا کے بجائے کائنات، روح کے بجائے مادّہ اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصوّر کے بجائے حیاتِ دنیوی کو اصل موضوع بحث قرار دیا گیا ہے"۔

یہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے، حرف بحرف صحیح ہے۔ آج مغرب شدید نوعیت کے الحاد اور انکارِ خدا کی لعنت میں گرفتار ہے چنانچہ آج مغرب میں منطقی ایجابیت (LOGICAL POSITIVISM) کا فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے اور اس کے علاوہ جو مدارسِ فکر مقبول ہیں وہ بھی سب کے سب انکارِ خدا اور روح و آخرت پر مبنی ہیں اور خالص مادیت کے حامی اور مبلّغ ہیں۔ مثلاً:۔

(ا) THE PHILOSOPHY OF AS IF جسکا سب سے پُرجوش حامی اور وکیل VAIHINGER ہے۔

(ب) PHENOMENALISM " " " " HUSSREL ہے

(ج) DIALECTICAL MATERIALISM جس کا سب سے پُرجوش حامی اور وکیل ہے MARX

(د)	NATURALISM	جس کا سب سے پُرجوش حامی اور وکیل ہے	SANTAYANA
(ہ)	AGNOSTICISM AND SCEPTICISM	〃 〃 〃 〃	J. S. MILL
(و)	EMERGENT EVOLUTION	〃 〃 〃 〃	LOYD MORGAN
(ز)	ATHEISM	〃 〃 〃 〃	MORRIS COHEN
(ح)	HUMANISM	〃 〃 〃 〃	SCHILLER
(ط)	REALISM	〃 〃 〃 〃	MOORE
(ی)	PRAGMATISM	〃 〃 〃 〃	DEWY
(ک)	LOGICAL EMPIRICISM	〃 〃 〃 〃	CARNAP
(ل)	EXISTENTIALISM	〃 〃 〃 〃	JEAN P.SRTRE
(م)	FREUDISM	〃 〃 〃 〃	FREUD
(ن)	BEHAVIOURISM	〃 〃 〃 〃	ADLER
(س)	COMMUNISM	〃 〃 〃 〃	LENIN
(ع)	SOCIALISM	〃 〃 〃 〃	LASKI
(ف)	LOGICAL ATOMISM	〃 〃 〃 〃	RUSSELL
(ص)	PHYSICAL REALISM	〃 〃 〃 〃	SELLARS

اِن تمام مدارسِ فکر میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ جو شئے حواسِ خمسہ سے محسوس نہ ہو اس کے وجود پر یقین کرنا سراسر حماقت ہے۔ چونکہ خدا، رُوح اور حیات بعد الموت تینوں غیر محسوس ہیں، اس لیے ان کی ہستی پر یقین خلافِ عقل ہے بلکہ یہ تینوں الفاظ مہمل ہیں کیونکہ ان کے مصادیق خارج میں کہیں موجود نہیں ہیں۔

یورپ میں لامذہبیت اور انکارِ خدا کے اسباب کی داستان بہت طویل ہے۔ جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہو انہیں حسبِ ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے:۔

1. CONFLICT BETWEEN RELIGION & SCIENCE
By DR. DRAPER.

2. HISTORY OF THE INTELLECTUAL DEVELOPMENT OF EUROPE By DR. DRAPER.

3. HISTORY OF THE WARFARE BETWEEN SCIENCE AND THEOLOGY By WHITE

4. HISTORY OF EUROPEAN MORALS By DR. LECKY

5. HISTORY OF FREE THOUGHT IN EUROPE By ROBERTSON

تاہم قارئین کی خاطر ذیل میں اجمالی طور پر کچھ اشارات درج کیے دیتا ہوں۔

(ا) جب JUSTINIAN قیصرِ رُوم نے یہ دیکھا کہ حکمائے یونان نصرانیت کے خلافِ عقل عقائد پر فلسفیانہ اعتراضات کرتے رہتے ہیں تو اس نے تنگ آ کر ۵۲۹ء میں اپنی قلمرو میں فلسفہ اور حکمت کی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا اور تمام فلاسفہ اور حکماء کو جلا وطن کر دیا۔

(ب) اغیار کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد نصرانیوں کی زبان بندی اور ذہنی غلامی کے لیے کلیسائے روم کے اساقفِ اعظم (POPES) نے یہ قانون نافذ کیا کہ جو عیسائی کسی مذہبی عقیدے یا کسی کلیسائی فرمان پر اعتراض کرے گا، اسے کلیسا سے بھی خارج کر دیا جائے گا اور ملعون قرار دے دیا جائے گا۔ یعنی جیتے جی اچھوت اور بعد وفات اس کا لاشہ بے گور و کفن!

(ج) اجانب اور اقارب دونوں کی طرف سے بے فکر ہو جانے کے بعد کلیسائے روم کے خلافِ عقل عقائد[1] (DOGMAS) کے ساتھ حسبِ ذیل احکام واجب الاذعان بھی نافذ کر دیئے۔

۱- معیارِ حق و باطل بائبل نہیں ہے بلکہ کلیسا ہے اور کلیسا سے مراد ہے پوپ اور اس کے

---

[1] مثلاً (ا) تثلیث جس کی رُو سے خدا بیک وقت و بیک جہت (باقی اگلے صفحے کے نیچے)

ماتحت مذہبی پیشواؤں کی جماعت۔

۲۔ ہر پوپ معصوم عن الخطا اور مطاع ہے اس لیے اس کے احکام میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔

۳۔ مذہب اور مذہبی عقائد میں عقل کو مطلق دخل نہیں ہے۔

بجا کہے جسے پاپا، اسے بجا سمجھو
زبانِ پوپ کو نقارۂ خدا سمجھو!

۴۔ کلیسائی روایات کا انکار بھی کفر ہے۔

۵۔ پوپ اور کلیسا کو گناہ معاف کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

۶۔ کلیسا کے علاوہ کسی شخص کو بائبل لکھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

(۷) تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں اندلس کے مشہور فلسفی ابن رشد (متوفی ۱۱۹۸ء) کی تمام تصانیف کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوگیا اور پندرہویں صدی میں اس کی تمام

وبیک حیثیت وبیک اعتبار ایک بھی ہے اور تین بھی ہے نیز وحدت بھی حقیقی ہے اور تثلیث بھی حقیقی ہے۔

(ب) تجسم جس کی رُو سے کلام (LOGOS) جو خدا کے ساتھ بھی ہے اور خدا بھی ہے، مجسم ہوکر یسوع کی شکل میں ظاہر ہوا۔

(ج) یسوع نے اگرچہ وہ خدا تھا اور خدا کی صورت میں تھا، بوجہ غایت فروتنی (HUMILITTY) اپنے آپ کو الوہیت سے معرّیٰ کر دیا اور غلام کی حیثیت اختیار کرلی اور صلیبی موت گوارا کرلی۔

(د) یسوع مسیح نے مصلوب ہوکر قیامت تک پیدا ہونیوالے انسانوں کے پیدائشی گناہوں کا کفارہ ادا کردیا۔

(ہ) جب پادری، عشاء ربانی کے وقت روٹی اور شراب پر یسوع کا نام لے کر دعا کرتا ہے اور اسے اپنے ہاتھ سے متبرک کر دیتا ہے تو وہ روٹی یسوع کا جسم اور شراب، یسوع کا خون بن جاتی ہے۔ اس ناقابلِ فہم عمل کو اصطلاح میں (TRANSUBSTANTIATION) کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا ترجمہ ہوگا استحالۂ جوہری یا انقلابِ ذات۔

تصانیف اٹلی اور فرانس کی یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں شامل ہوگئیں۔ ان تصانیف کی بدولت یورپ ایک ہزار سال کے بعد ارسطو کے فلسفے سے واقف ہوا اور اس کی وجہ سے یورپ میں سولہویں صدی میں دو تحریکیں رونما ہوئیں جن کا نام "احیاء العلوم" اور "اصلاحِ کلیسا" ہے۔ چنانچہ رومن کیتھولک کلیسا، جس کے خلاف لوتھر نے صدائے احتجاج بلند کی اس بات کی معترف ہے کہ لوتھر بڑی حد تک ابن رشد کے فلسفے سے متأثر ہوا تھا میری تحقیق بھی یہی ہے کہ لوتھر کے دماغ میں کلیسا کی اصلاح کا خیال ابن رشد کی تصانیف کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا۔

قصہ مختصر سولہویں صدی میں حسب ذیل پادریوں نے جو رومی کلیسا سے وابستہ تھے، کلیسا کی چیرہ دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی: ERASMUS م ۱۵۳۶ء، ZIVINCLI م ۱۵۳۱ء، LUTHER، م ۱۵۴۶ء، MCLANCTHON م ۱۵۶۱ء اور CALVIN م ۱۵۶۴ء۔ ان کا سربراہ لوتھر تھا اس نے یہ اعلان کیا کہ بائبل کی صداقت کا دارومدار کلیسا پر نہیں ہے (جیسا کہ کلیسا کہتی تھی)، بلکہ خود کلیسا کی صداقت کا دارومدار بائبل پر ہے یعنی معیارِ حق و صداقت بائبل ہے نہ کہ پوپ یا کلیسا۔

لوتھر اور اس کے ہمنواؤں کے احتجاج (PROTEST) کا نتیجہ یہ نکلا کہ رومن کیتھولک مذہب کے مقابلے میں یورپ میں پراٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوگیا اور کلیسا کا اقتدار بڑی حد تک ختم ہوگیا۔

تحریک احیاء العلوم کی بدولت یورپ میں فلسفے (خصوصاً فلسفۂ ارسطو) کے مطالعے کا ذوق از سر نو زندہ ہوگیا اور جب اس کی بدولت یورپ کو عقلی آزادی نصیب ہوئی تو سترھویں صدی میں سائنس کا دور شروع ہوا جو آجکل بیسویں صدی میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا ہوا ہے۔

(۵) اہل سائنس اور اہل فلسفہ دونوں نے کلیسائیت اور نصرانیت کے خلاف عقل عقائد پر اعتراضات وارد کیے۔ کلیسا اور نصرانیت دونوں ان کے جوابات سے قاصر اور عاجز تھیں۔ اس لیے انہوں نے معترضین کو کلیسا اور مذہب دونوں سے خارج کر دیا۔

کلیسا سے دوسری غلطی یہ ہوئی کہ اس نے سائنس کی تحقیقات کو بھی مذہب کے خلاف قرار